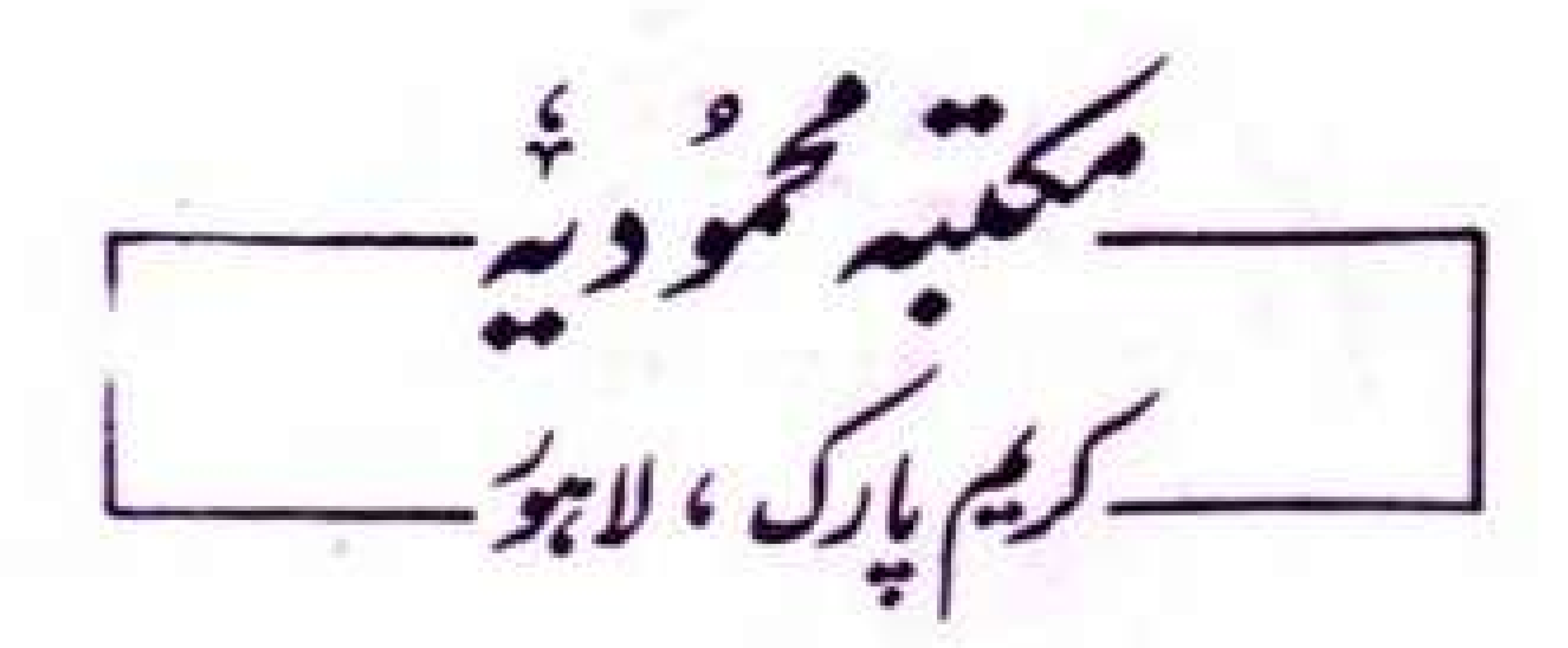

اقبال کے ممدوح علما
قاضی افضل حق قریشی
مکتبہ محمودیہ
کریم پارک، لاہور

اقبالؒ کے ممدوح علماء

قاضی افضل حق قریشی



اشاعتِ اوّل

بسلسلۂ سالِ اقبال ۱۹۷۷ء

نام کتاب ------- اقبال کے ممدوح عُلماء

مؤلف -------- قاضی افضل حق قرشی

ناشر --------- مکتبۂ محمودیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور

مطبع ---------: استقلال پریس لاہور

صفحات --------- ۱۴۴

تعداد ---------- ۵۰۰

کتابت -------- محمد جمیل حسن تلمیذ سید نفیس رقم صاحب مدظلہ

قیمت (مجلّد) ------- ۱۵ روپے ، غیر مجلّد ۱۲ روپے

اِنتساب

خلوص و محبّت کے پیکر، مخدوم و محترم

جناب سیّد انور حُسین نفیس رقم

کے نام

فہرست

خراجِ تحسین

اقبالؒ

خطاب بہ علماءِ حق

ای ز افکارِ تو مومن را حیات — از نفسہائے تو ملت را ثبات

حفظِ قرآنِ عظیم آئینِ تست — حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست

تو کلیمی چند باشی سرنگوں — دستِ خویش از آستیں آور بروں

سرگذشتِ ملتِ بیضا بگوے — با غزال از وسعتِ صحرا بگوے

فطرتِ تو مستنیر از مصطفیٰ است
باز گو آخر مقامِ ما کجاست؟

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بو — مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو

ہر زمان اندر تنش جانے دِگر — ہر زمان او را چو حق شانے دِگر

راز ہا با مردِ مومن باز گوے — شرحِ رمزِ کُلَّ یَوْمٍ باز گوے

جز حرم منزل ندارد کارواں — غیرِ حق در دل ندارد کارواں

کارواں دیگر نگاہش دیگر است!
من نمی گویم کہ راہش دیگر است

خیز و سوزِ سینہ با احرار دہ — رہرواں را گرمیٔ گفتار دہ

(انوارِ اقبال صـ۳۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

رجالِ اقبال کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع علماء و مشائخ ہیں۔ ان حق آگاہ درویشوں کا فقر جو جنگاہ میں بے ساز و یراق آیا، ان کا اعتمادِ نفس اور قوتِ ایمانی، جس نے استعمار، جبر اور الحاد کے خلاف قلندرانہ تجلی، اقبال کے مثالی پیغام کی تعمیل کرتا نظر آتا ہے

علامہ اقبال نے علماء اور مشائخ کے نام خطوط میں مکتوب الیہم کے لیے جو القاب و آداب استعمال کیے، اُن سے ان کیلئے علامہ کی گہری اور قلبی عقیدت و محبت آشکارا ہے۔ ان خطوط میں علامہ کا انداز بہت محتاط اور مؤدبانہ ہے۔ وہ برابر مکتوب الیہ کی علمیت اور عظمت کا تذکرہ اور اپنے عجز، انکسار اور ہیچمدانی کا اعتراف کرتے ہیں۔

پیشِ نظر مجموعہ میں علماء کے لیے علامہ کے جذباتِ احترام و محبت کا اظہار ہوتا ہے اور ان سے علامہ کے روابط پر روشنی پڑتی ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اس مجموعہ میں صرف علامہ کی اپنی تحریروں اور تقریروں سے اقتباس شامل کیے جائیں۔ مسموع روایات سے اجتناب ہی کیا گیا ہے۔ ایک گروہ جس

نے ساری عمر اقبال کی تکفیر کی آج اسی کے سہارے قد اونچا کرنے کی فکر میں لگا ہُوا ہے اور اس کی وفات پر ربع صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اس سے روایتیں منسوب کی جانے لگی ہیں —— ڈاکٹر عابد احمد علی مرحوم نے اپنے ایک مقالے میں مولوی احمد رضا خاں کے ضمن میں اقبال سے ایک روایت منسوب کی ہے۔ لکھتے ہیں :

"۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ وہ ہے جس میں اقبال تقریباً ہر سال علیگڑھ گئے ہوں گے .... اقبال نے مولانا کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ....؛"

پہلے تو "گئے ہوں گے" کے الفاظ پر غور کیجئے اور پھر اس کے بعد روایت کی استنادی حیثیت کا اندازہ کیجئے

اقبال ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک ہر سال علیگڑھ نہیں گئے —— اس عرصہ میں وہ ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد صرف ۱۹۳۴ء میں علیگڑھ گئے تھے اور اس کے بعد وہ کبھی علیگڑھ نہیں گئے۔

مزید برآں علاّمہ مرحوم نے علمی اشکالات کے ضمن میں اپنے ہر قابلِ ذکر معاصر سے رجوع کیا اور اپنی کسی نہ کسی تحریر میں اس کا ذکر کیا لیکن مولوی احمد رضا خاں کے بارے میں ان کے ہاں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ برسبیلِ تذکرہ مولوی احمد رضا کے خلفاء مولوی دیدار علی اور مولوی حشمت علی اور ان کے دیگر خوشہ چینوں نے اقبال کی تکفیر کی۔

علاّمہ اقبال مرحوم پر ہی کیا موقوف ہے، غلام ہندوستان میں مسلمانوں کی ہر دینی و سیاسی آزادی پسند تحریک، تحریکِ مجاہدین سے تحریکِ پاکستان تک اور مسلمانوں کا ہر واجب الاحترام رہنما شاہ اسمٰعیل شہید سے قائدِ اعظم تک ان کی مشق کافر گری کا نشانہ بنا رہا۔

علّامہ کی تحریروں اور تقریروں سے اقتباسات کے علاوہ معاصر علمار سے علّامہ کے تعلّقات پر چند مقالات بھی شامل ہیں ـــــــ مقالہ نگاروں میں سیّد صباح الدین، عبدالرحمٰن، سیّد سلیمان ندوی کے شاگرد ہیں اور دارالمصنّفین شبلی اکادمی اعظم گڑھ کے ڈائرکٹر ہیں، مولانا محمّد انوری، علّامہ محمّد انور شاہ کشمیری کے خاص شاگرد تھے اور حضرت علّامہ کے سفر و حضر کے ساتھی بھی جناب یوسف سلیم چشتی، مشہور ماہر اقبالیات ہیں انھیں کئی برس علّامہ کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ آغا شورش کاشمیری، سیّد عطار اللہ شاہ بخاری اور علّامہ اقبال دونوں کے عقیدت مند ہیں۔ وہ کئی برس شاہ جی کی قیادت میں کام کرتے رہے اور پاکستان میں مرکزیہ مجلس اقبال کے تادمِ آخر جنرل سیکرٹری رہے۔ مولانا فضل الرحمٰن سواتی کا مقالہ ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے۔ لیکن اس سے حضرت علّامہ کے رجحانِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی کسی رائے سے رجوع کرنے میں عار محسوس نہیں کی۔

قاضی فضل حق قریشی

اِفتتاحیہ

اِقبال اور عُلماء

علّامہ اقبال دورِ حاضر کے نام نہاد دانشوروں کے برعکس علماء کا بے حد احترام کرتے تھے۔ علّامہ کے نزدیک "علماء ہمیشہ اسلام کے لیے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں" (حرفِ اقبال ص ۱۶۳)

ایک بار سیّد نذیر نیازی کی اس بات پر کہ آپ نے اسلام کی عقلی تعبیر میں نفسِ انسانی یا کسی اور مابعد الطبیعی مسئلے حیات بعد الموت یا زمان و مکان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، علمائے اسلام بظاہر ان سے بیگانہ نظر آتے ہیں، علّامہ نے کہا :

"یہ کہنا کہ علمائے اسلام ان حقائق سے بے خبر تھے، صحیح نہیں۔ وہ اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ ان کی نظر ہر بات پر تھی۔ وہ تہذیب و تمدن اور اجتماع و عمران کے مسائل سے غافل تھے نہ علم و حکمت اور مابعد الطبیعی افکار سے جس میں قرآن مجید نے ان کی راہنمائی کی۔ یہ انھیں کا تو کہنا تھا کہ قرآن مجید خلاصۂ کائنات ہے۔" (اقبال کے حضور ص ۱۶۲)

علامہ کے نزدیک اسلام نام ہے علمائے باعمل کی صحبت کا"۔

(مکتوب بنام شبیر بخاری۔ صحیفہ اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۴)

تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات میں علامہ جمعیتہ العلمارِ ہند کے فیصلے کے منتظر تھے۔
ایک موقع پر انھوں نے کہا:

"ہم مذہب کو تمام چیزوں سے بالاتر سمجھتے ہیں اور علمائے کرام کو اپنا حَکَم سمجھتے ہیں۔ جمعیتہ العلمارِ ہند جو کچھ فیصلہ کرے گی، وہی ہماری رائے ہے"۔ (اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام ص ۹۸)

مُدیرِ زمیندار کے نام ایک خط میں لکھا:

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حالاتِ حاضرہ محض ایک سیاسی مفہوم رکھتے ہیں اور پختہ کارانِ سیاست ہی اس کے فیصلہ کے اہل ہیں اور مسند نشینانِ پیغمبر کو ان حالات سے کچھ سروکار نہیں، وہ میری رائے ناقص میں ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں جو حقائق و تاریخ اسلامیہ اور شریعت حقہ کے مقاصد کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ قومی زندگی کی کوئی حالت ایسی نہیں جس پر فقہائے اسلام نے حیرت انگیز چھان بین نہ کی ہو"۔

(اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام ص ۱۰۲)

علامہ علمار کے انگریز دشمن کردار اور حریت پسندی سے خوش تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

"اربابِ دیوبند ہوں یا علمار کی کوئی دوسری جماعت، میرے دل میں ان کے جذبۂ آزادی، ان کی انگریز دشمنی اور دین کے لیے غیرت و حمیت کی بڑی قدر ہے" (اقبال کے حضور ص ۲۹۱)

علامہ کے نزدیک برِ عظیم کے علمار دُنیائے اسلام کی رہنمائی کے اہل تھے۔ سیّد سُلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"اس وقت مذہبی اعتبار سے دُنیائے اسلام کو رہنمائی کی سخت ضرورت ہے اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علمار اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوامِ اسلامیہ کو کوئی ایسی مدد نہیں دے سکتے، ہاں دماغی اعتبار سے ان کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔" (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۴۴، ۱۴۵)

(۲)

برِ عظیم پاک و ہند میں علمائے حق کا کردار ہمیشہ روشن اور مثالی رہا ہے۔ ہماری ملی تاریخ میں مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سیّد احمد شہیدؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمود حسنؒ کے نام دعوت و عزیمت کی علامت ہیں ـــــ یہ سب برِ عظیم میں اسلامی سلطنت کے قیام اور اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں رہے۔ سر ولیم بارٹن کے مطابق "مسلم ہندوستان میں ہمیشہ مذہبی جذبات کام کرتے رہے جن میں برطانیہ اور ہندو کے خلاف برابر کی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ دوبارہ اسلامی حکومت قائم ہونے کا خواب دیکھتے رہے۔ ان جذبات کو خفیہ انجمنیں مثلاً خدامِ کعبہ، دارالعلوم دیوبند ... ہوا دیتی رہیں" (انڈیاز نارتھ ویسٹرن فرنٹیر ص ۱۵۵)

دارالعلوم دیوبند کے متعلق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی تصنیف "برِ عظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ" میں لکھتے ہیں :

"دیوبند کا مدرسۃ العلوم اپنی تمام قدامت پسندی کے باوجود عملی مطمحِ نظر رکھتا تھا اور اس نے اپنے کام سے کام رکھا۔ اس نے علیگڑھ پر سنگ باری نہیں کی، اگرچہ وہ سیّد احمد خاں کی آرار اور ان

کے افعال سے متفق نہیں ہو سکتا تھا۔ دیوبند میں علماء کا ایک گروہ ایسا تھا جو اتحادِ اسلامی کا شبلی یا ابوالکلام سے کم پُرجوش حامی نہیں تھا مگر اس گروہ نے اس خیال کو مقبول بنانے کے لیے تبلیغ و اشاعت کی مہم جاری نہیں کی وہ موقع کا منتظر رہا اور اس نے حج کے ارادے کے ذریعے باب عالی سے روابط پیدا کرنے کی کوشش کی . . . . دیوبند کے رہنماؤں اور باب عالی کے درمیان روابط کی تاریخ کے متعلق تفصیلات پوری طرح معلوم نہیں ہیں، کیونکہ ان کی نوعیت راز دارانہ تھی۔ ان کے وجود کا انکشاف مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگرمیوں سے ہُوا جو ہندوستان سے فرار ہو کر کابل چلے گئے اور وہاں سے پہلی عالمی جنگ کے دوران ترکوں کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے نتائج خواہ کچھ بھی ہوئے ہوں مگر ان علماء کے اس عقیدے کے مطابق کہ سلطان ترکی خلیفہ ہے اور جب وہ جنگ میں مشغول ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ کم سے کم ایک جرأت مندانہ اقدام ضرور تھا انھوں نے ترکوں کے ساتھ روابط قائم کرنے کا فیصلہ اس کے بعد کیا تھا جب کہ ان پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ برِعظیم میں مسلمان دوبارہ اپنی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ جنگ سے قبل دس سال سے زیادہ عرصہ ایسا گزرا تھا جس میں انھیں اس کا یقین ہو گیا تھا کہ برطانیہ کی حکمتِ عملی دنیائے اسلام کی آزادی کے خلاف ہے۔ انھیں اس کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ حکمتِ عملی ہندوستان پر برطانوی تسلط کو تقویت پہنچانے کے لیے اختیار کی جا رہی ہے۔ یہ امر ان کے عقیدے کا جزو ہو گیا کہ ہندوستان کی آزادی سے دُنیائے اسلام پر یہ دباؤ ختم ہو جائے گا، کیونکہ اس کے بعد اس کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی، کہ

برطانیہ اسلام کے ریگستانی علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس تجزیے میں بہت کچھ سادگی تھی۔ یہ ایک حد تک ترکوں کی تبلیغ کا نظریہ تھا۔ تاہم تیل کی دریافت سے پہلے اس میں صداقت کا ایک عنصر موجود تھا، کیونکہ یہ ممالک برطانوی سلطنت کے مواصلات میں آڑے آتے تھے"۔

("برِ عظیم پاک وہند کی ملتِ اسلامیہ" ص ۳۳۸ - ۳۴۰)

علامہ مرحوم دار العلوم دیوبند اور اس کے کردار سے متاثر تھے۔ انھوں نے ایک بار کہا:

"دیوبند ایک ضرورت تھی۔ اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل۔ وہ روایت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم ہے"۔

(اقبال کے حضور ص ۲۹۳)

صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے نام "علومِ اسلامیہ" کے متعلق ان کے نوٹ کے جواب میں لکھا:

"میری رائے ہے کہ دیوبند اور ندوہ کے لوگوں کی عربی علمیت ہماری دوسری یونیورسٹیوں کے گریجویٹ سے بہت زیادہ ہوتی ہے"

(اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۲۳)

نیز "میں آپ کی اس تجویز سے پورے طور پر متفق ہوں کہ دیوبند اور لکھنؤ کے بہترین مواد کو بر سر کار لانے کی کوئی سبیل نکالی جائے"

(اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۱۷)

اس پورے خط میں علوم اسلامیہ کا محور دیوبند اور لکھنو نظر آتے ہیں۔

مولانا قاری محمد طیب راوی ہیں کہ ایک بار کسی نے علامہ سے پوچھا کہ یہ دیوبندی کیا کوئی فرقہ ہے؟ کہا "نہیں، ہر معقول پسند دیندار کا نام دیوبندی ہے"۔

(علمائے دیوبند کا مسلک ص ۵۵)

(۳)

فی الحال میں قارئین کی توجہ چند مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ٹیپو کی شکست اور ایشیا میں مغربی شہنشاہیت کی آمد کے بعد اسلامی ہند میں پیدا ہو گئے ہیں۔ کیا اسلام میں خلافت کا تصوّر ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ مسلمانانِ ہند اور وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں، ترکی خلافت سے تعلّق رکھتے ہیں؟ ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟ اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی آیت "خدا، رسول اور تم میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو" میں الفاظ "تم میں سے" کا کیا مفہوم ہے۔ احادیث سے آمد مہدی کی جو پیشین گوئی کی جاتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ یہ اور اسی قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداہتہً صرف مسلمانانِ ہند سے تھا۔ اس کے علاوہ مغربی شہنشاہیت کو بھی جو اس وقت اسلامی دُنیا میں سرعت کے ساتھ تسلّط حاصل کر رہی تھی۔ ان سوالات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر۔ مسلمان اربابِ سیاست جن کی آنکھیں واقعات پر جمی ہوئی تھیں علماء کے ایک طبقہ کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ دینیاتی استدلال کا ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جو صورتِ حال کے مناسب ہو۔ (حرفِ اقبال۔ ص ۱۴۲۔۱۴۳)

مذکورہ بالا خیالات کا اظہار علّامہ مرحوم نے اپنے مقالہ "اسلام اور احمدیت" میں فرمایا ہے

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ علماء کے اسی گروہ نے فقہی تعبیروں اور تاویلوں کے سہارے برِعظیم میں برطانوی سلطنت کو استحکام بخشا۔ جب ان کے ہم وطن سکھوں اور انگریزوں کے خلاف سلطنتِ اسلامیہ کے احیاء کے لیے برسرِ پیکار تھے، وہ اُن کے خلاف

برسرِ پیکار رہے۔ جذبہ جہاد کو کچلنے کے لیے حکمرانوں کو دُہائی دی گئی کہ یہ جہاد کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں اور "ہندوستان دارالاسلام" کے فتوے لکھے اور لکھوائے گئے۔ مولوی احمد[۱] رضا خان نے بھی ہندوستان کو دارالاسلام ثابت کرنے کے لیے مستقل ایک رسالہ بنام "اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام" لکھا۔

رُوحِ جہاد کو کچلنے کے بعد "خلافت" مسلمانانِ عالم کا ایک مقدس ادارہ رہتا تھا۔ انگریزوں کو اس کے اثر اور اہمیت کا احساس تھا یہی وجہ تھی کہ ۱۷۹۹ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے سلطان ترکی کو درخواست کی گئی کہ وہ ٹیپو سلطان کو سمجھائیں کہ وہ نپولین کی امداد نہ کرے اور بعد میں ۱۸۵۷ء میں انھوں نے پھر سلطان ترکی سے استدعا کی کہ وہ مسلمانوں کو ہدایت کریں کہ "غدر" میں شرکت سے باز رہیں۔ یار لوگوں نے اس عمارت کو بھی ڈھانے کی ٹھان لی اور "الائمۃ من القریش" کی خود ساختہ تاویلیں شروع کر دیں۔ "دوام العیش فی الائمۃ من القریش" قسم کی کتابیں لکھی گئیں۔ اور جب مغربی شہنشاہیت نے خلافتِ عثمانیہ کو تباہ کر دیا تو اسی قبیل کے کچھ بزرگوں نے جلیانوالہ باغ امرتسر کے قتلِ عام کے ذمّہ دار بدنامِ زمانہ جنرل

---

[۱] "مولوی احمد رضا خاں کے پر دادا حافظ کاظم علی خان بریلوی نے انگریزی حکومت کی پولٹیکل خدمات انجام دیں"۔ (بحوالہ حیات اعلٰحضرت مصنفہ ظفر الدین بہاری ص۳۲)

اور خود مولوی احمد رضا خان کے متعلق فرانسس رابنسن لکھتا ہے:

"اُن کا معمول کا طریقِ کار حکومت کی حمایت تھی اور جنگِ عظیم اوّل اور تحریکِ خلافت میں انھوں نے مسلسل حکومت کی حمایت جاری رکھی اور ۱۹۲۱ء میں بریلی میں ترکِ موالات کے مخالف علماء کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ ان کا عوام پر خاطر خواہ اثر تھا لیکن مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے کی حمایت حاصل نہ تھی"۔

(بحوالہ سیپریٹزم امنگسٹ انڈین مسلمز ص۴۴۲ کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۷۴ء)

اوڈوائر کو مبارک باد دی اور ایک تقریب میں اسے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے حکمرانوں کو یقین دلایا کہ :

" ہم اور ہمارے پیروان اور مریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکارِ برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں، ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جاں نثار رہیں گے "۔

(تکفیری افسانے ص ۱۴۳ ، کاروانِ احرار ص)

اسی پر بس نہیں۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مسلمانانِ ہند نے جب از سرِ نو برِ عظیم کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی جدّوجہد کا آغاز کیا تو یہ گروہ پھر سرگرم عمل ہوا۔ ہماری ملّی تاریخ کا وہ کون سا اہم نام ہے جو اُن کے ناوکِ تکفیر سے محفوظ رہا ہو۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، سرسیّد، شبلی، حالی، ظفر علی خاں، ابوالکلام، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، محمد علی جوہر کے بعد اقبال اور قائدِ اعظم بھی ان کی دست درازیوں سے نہ بچ سکے۔ ؏

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ایسے کفریہ فتاویٰ سے ہزاروں صفحات سیاہ کیے گئے۔ تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل کتب و رسائل ملاحظہ کیجیے :

(۱) " قہر القادر علی الکفار اللیاڈر " ملقب بہ لیڈروں کی سیاہ کاریاں :
مصنفہ مولوی محمد طیب قادری برکاتی۔ فاضل مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور
مطبوعہ مطبع سلیمانی بمبئی۔ بار دوم ۱۳۵۹ھ

(۲) " مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری " :
مصنف مولوی اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہری
شائع کردہ دفتر جماعت اہلسنت خانقاہ برکاتیہ مارہرہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۹ء

(۳) " احکامِ نوریہ شرعیہ بر مسلم لیگ " : مصنفہ مولوی حشمت علی خاں

حسب فرمائش جماعت اہلسنت مارہرہ مطبوعہ مطبع سلیمانی بمبئی مطبوعہ ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء

(۴) "الجوابات السنیۃ علیٰ زہار السوالات اللیگیۃ":

مجموعہ فتاویٰ (۱) مولوی اولاد رسول محمد میاں سجادہ نشین مارہرہ (۲) حکیم سید آل مصطفیٰ قادری برکاتی مارہری (۳) مولوی حشمت علی خاں (۴) مولوی ابوالبرکات سید احمد قادری ناظم مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور

مطبوعہ مطبع سلطانی بمبئی ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء

(۵) "تجانب اہل سنۃ"

مصنف مولوی محمد طیب قادری برکاتی فاضل مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور مطبوعہ بریلی ۱۹۴۲ء

(۶) الدلائل القاہرہ علی الکفرۃ النیاچرہ

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زعماء پر مولوی احمد رضا خاں کا فتویٰ تکفیر۔ جو بعد میں مسلم لیگ پر بھی چسپاں کر دیا گیا۔ اس فتوے کی تائید پر مولوی نعیم الدین مراد آبادی، مولوی دیدار علی، مولوی عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (والد مولانا شاہ احمد نورانی) سمیت اسّی بریلوی علماء کے دستخط ثبت ہیں۔

(۷) اَلقَسْوَرَہ عَلیٰ اَدْوَارِ الْحُمُرِ الکَفَرَۃِ ملقب بلقب تاریخی ظفر علی رَمۃٍ مَن کَفَر
۱۳ ۴۳ ۲۵ ۱۹
مؤلفہ: مولوی محمد مصطفیٰ رضا خان مرتبہ: مولوی ابوالبرکات سید احمد قادری

یہ چند نام مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ورنہ
"سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے"

علامہ اقبال کے متعلق اُن کی گوہر افشانیوں کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

عبدالمجید سالکؔ ذکرِ اقبالؔ میں لکھتے ہیں:

"مولانا ابو محمد دیدار علی[۱] خطیب مسجد وزیر خان نے نہ صرف اقبال کی تکفیر کی بلکہ تمام مسلمانوں کو انتباہ کیا کہ وہ ان سے ملنا جُلنا ترک کر دیں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے"۔ (ذکرِ اقبال ص ۱۲۹)

اسی قبیلہ کے ایک اور فرد ہیں ابوالطاہر محمد طیب صدیقی قادری برکاتی قاسمی دانا پوری فاضل مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور، ان کی تصنیف "تجانب اہل السنۃ عن اہل الفتنہ" میں جہاں اور مسلم اکابر کی تکفیر کی گئی ہے، وہاں علامہ مرحوم کو بھی دشنام طرازی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"یہ ترجمانیٔ حقیقت ہے یا ترجمانیٔ ابلیسیت" ص ۳۳۶

"ڈاکٹر صاحب کی زبان پر ابلیس بول رہا ہے" ص ۳۴۰

اور "مسلمانانِ اہلِ سُنّت خود ہی انصاف کرلیں کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہب کو سچے دینِ اسلام سے کیا تعلق ہے" ص ۳۴۱

فتاویٰ کُفر کے اس مجموعے پر بڑے بڑے خدامِ رضا کی مُہرِ تصدیق ثبت ہے۔ ذرا

---

[۱] مولوی دیدار علی الور کے رہنے والے تھے۔ اسی مناسبت سے حضرت علامہ نے الور پر یہ چار اشعار لکھے جو "روزگارِ فقیر" جلد دوم میں شامل ہیں۔

گر فلک در اَلور اندازد ترا!	اے کہ می داری تمیزِ خوب و زشت
گویمت در مصرعِ برجستۂ	آنکہ بر قرطاسِ دل باید نوشت
آدمیّت در زمین اُو مجو!	آسمان این دانہ در اَلور نہ کشت
کِشت اگر ز آب و ہوا خر رستہ است	زانکہ خاکش را خرے آمد سرشت

(ص ۲۳۲، ۲۳۳)

ان کے اسمار گرامی اور القابات ملاحظہ ہوں :

۱۔ حضرت عظیم البرکت تاج العلمار سراج العرفا وارث الاکابر الاسیاد بالاستحقاق والانفراد حامی السنن ماحی الفتن مولانا مولوی حافظ مفتی سیّد شاہ اولادِ رسول محمّد میاں صاحب قبلہ قادری برکاتی قاسمی مارہری دامت برکاتہم القدسیہ مسند نشین سجادۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ سرکارِ کلاں۔ مارہرۂ مطہرہ ضلع ایٹہ۔ (ناظمِ اعلیٰ جماعت مرکزیۂ عالیہ اہلسنت مارہرہ)

۲۔ حضرت سراپا برکت ناصرِ سنّیت کاسرِ لامذہبیت طبیب امراض روحانی معالج اسقام جسمانی، گلِ گلشن آلِ عبا گلبن چمنستانِ اہلِ کسا سیّد العلمار سند الحکمار مولانا مولوی حافظ قاری حکیم سیّد شاہ آلِ مصطفےٰ قادری برکاتی قاسمی دامت فیوضہم المبارکہ سرکارِ کلاں، مارہرۂ مطہرہ ضلع ایٹہ۔

۳۔ حضرتِ بابرکت ضیائے دین و ملّت حامیٔ اسلام و سُنّیت ماحیٔ بدمذہبی و لامذہبیت مولانا مولوی حاجی مفتی شاہ ابوالمساکین محمّد ضیاء الدین صاحب قادری رضوی ضیائی دام ظلہم الاقدس، مفتیٔ شہر پیلی بھیت۔

۴۔ شیر بیشۂ سنّت ناصر الاسلام مظہر اعلیٰحضرت مولانا مولوی حافظ قاری مفتی شاہ ابوالفتح عبید الرضا محمد حشمت علی خاں قادری برکاتی رضوی مجددی لکھنوی دام ظلہم العالی

۵۔ اسد السنۃ ضیغم الملّۃ وصاف الحبیب حضرت مولانا مولوی حافظ قاری مفتی ابواللطف محب الرضا محمد محبوب علی خان صاحب قادری رضوی مجددی لکھنوی زید مجدہم العالی۔
(مفتی دار الافتائے عالیہ اسلامیہ وخطیب جامع مسجد ریاست پٹیالہ پنجاب)

ایک اور صاحب مولوی بدر الدین احمد قادری رضوی، صدر المدرسین دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف نے مولوی احمد رضا خاں کی سوانح میں ایک عنوان "نام نہاد مفکرِ اسلام" باندھا ہے اور علامہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ کیجئے :

" ڈاکٹر سر اقبال نے بھی اپنی شاعری کے بل بوتے پر اسلام کو کچھ کم دھکا نہیں پہنچایا ہے . . .

انھیں باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود ساختہ مفکرِ اسلام نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں الحاد، دہریت، بے دینی و نیچریت کا بیج کس قدر بویا ہوگا۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ . . . نیچریوں کا شور ہے کہ سر محمد اقبال ترجمانِ حقیقت اور مفکرِ اسلام ہیں۔ ایشیا کے شعرا ان کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے ہیں۔ یورپ کے فلاسفر ان کا علمی لوہا تسلیم کر چکے ہیں لیکن میری طرف سے گزارش ہے کہ

وہ سبھی کچھ ہیں بتاؤ کہ مسلمان بھی ہیں " (ص ۳۳ تا ۴۲)

علائے علماء و مشائخ کے اسی گروہ سے بد دل تھے اور مایوس بھی اور اسی طبقے کے مفتیوں نے تسفنیوں کا روپ دھار کر امتِ مسلمہ میں تفرقہ اندازی کی جس پر علامہ مرحوم کو یہ لکھنا پڑا :

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

علامہ مرحوم کا یہ طنزیہ شعر بھی اسی گروہ کی نذر ہے ؎

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

سرکشن پرشاد شاد کے نام حافظ جماعت علی شاہ صاحب کے متعلق لکھا :

" حافظ علی شاہ صاحب کو میں بہت عرصہ سے جانتا ہوں۔ وہ ہمارے ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ پیری مریدی کے آغاز سے پہلے بھی جانتا تھا اور اب بھی ان کے حالات سے ناواقف نہیں ہوں۔ ایک دفعہ بنگلور میں ان کی وجہ سے بہت فساد ہونے کو تھا۔ ان کا وجود مسلمانوں میں اختلاف کا باعث ہوا۔ وہاں کے مسلمانوں نے مجھے ایک خط لکھا

جس میں یہ تقاضا کیا گیا تھا کہ میں ان کے حالات بلا رُو رعایت لکھوں تاکہ فساد رفع ہو۔ میں نے جو کچھ مجھے معلوم تھا لکھ دیا۔ الحمدللہ کہ وہ فساد رفع ہو گیا اور حافظ صاحب مع اپنے مریدوں کے وہاں سے رخصت ہوئے۔ وہ بڑے ہوشیار آدمی ہیں اور پیری مریدی کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ بے اعتنائی ان لوگوں کی بالعموم مصنوعی ہوتی ہے اور اس میں سینکڑوں اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں، جس طرح وہ سرکار سے پیش آئے ہیں، اس طرزِ عمل کا مفہوم بخوبی سمجھتا ہوں۔ ان کے ہاں جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آپ ان کی سمجھ اور گرفت سے بالاتر ہیں"۔ (اقبال نامہ حصہ دوم ص ۱۷۹، ۱۸۰)

ایسے ہی علماء کے متعلق علامہ مرحوم نے فرمایا تھا:

دینِ حق از کافری رُسوا تر است ۔۔۔ زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است

از شکر فیہائے آں قرآں فروش ۔۔۔ دیدہ ام رُوح الامین را در خروش

زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ ۔۔۔ نزدِ او امّ الکتاب افسانۂ

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ ۔۔۔ آسمانش تیرہ از بے کوکبی!

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ۔۔۔ مِلّت از قال و اقولش فرد فرد!

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب ۔۔۔ کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب!

دینِ کافر فکر و تدبیر جہاد

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد (جاوید نامہ۔ کلیات اقبال فارسی ص ۶۶۴)

یہ وضاحت ضروری ہے کہ بریلوی مکتبِ فکر کے مولویوں کے سوا برِعظیم پاک و ہند کے کسی بھی عالم نے علامہ اقبال کی تکفیر نہیں کی۔

فضل حق قریشی

اقبال مولانا سیّد میر حسن کی خدمت میں

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

دُعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

(کلیاتِ اقبال صـ۹۷)

۱۹۰۵ء میں انگلستان جاتے ہوئے درگاہِ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ پر اقبال نے اپنے جذبات کو "التجائے مسافر" کے عنوان سے نظم کیا۔ مندرجہ بالا اشعار اسی نظم کا حصہ ہیں اور شاہد ہیں اس ارادت و عقیدت کے جو ایک سعادتمند شاگرد کو اپنے واجب الاحترام استاد سے ہے۔ اقبال کا کوئی تذکرہ اِس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں اس کے اس محسن استاد کا ذکر نہ ہو جس کے فیض سے اقبال" ذوقِ تپش سے آشنا ہُوا"۔

مولانا سیّد میر حسن سیالکوٹی ۸ اپریل ۱۸۴۴ء کو موضع فیروزوالا ضلع گوجرانوالہ

میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف کی تعلیم اپنے والد سید محمد شاہ صاحب سے حاصل کی اور ابتدائی کتب مولانا شیر محمد صاحب سے پڑھیں۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں سید میر حسن حافظ اور مولوی بن گئے۔ سولہ سال کی عمر میں مشن سکول میں استاد مقرر ہوئے اور جب مشن سکول کالج بنا تو اس میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر بنے۔ تراسیٹھ سال کی عمر میں ۱۹۲۹ء میں بصارت سے محرومی کی وجہ سے ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور اسی سال ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

منشی سراج الدین مولانا کے متعلق تحریر کرتے ہیں :

" انھیں بلا مبالغہ علم شعر کا زندہ کتب خانہ کہا جا سکتا تھا۔ ادنیٰ موقعہ اور محل پر عرب جاہلیت سے لے کر فارسی اور اردو کے اساتذہ کو لپیٹتے ہوئے وارث شاہ، فضل شاہ، بلھے شاہ اور حیدر علی کے کلام سے وہ وہ بے نظیر اشعار پیش فرماتے کہ ذوق صحیح کی روح فی الجملہ وجد میں آ جاتی تھی۔ سعدی، حافظ، فردوسی، نظامی، خاقانی، انوری، عرفی، نظیری سے لے کر بیدل اور غالب تک تو ہاتھ باندھے موزونیٔ طبع کے سامنے کھڑے ہی رہتے تھے، مگر ان کے علاوہ خاص سودیشی شعرا کا کلام بھی ایسے ہی حفظ تھا جیسے بعض یہود کو تورات اور مسلمانوں کو قرآن حفظ ہوتا ہے۔"

منشی صاحب ہی ان کے گھر والے مکتب کا نقشہ پیش کرتے ہیں :

" صبح و شام جب اپنے بیت العلوم (مسکن) پر تشریف رکھتے تو گردو پیش کے بوریے عجیب منظر پیش کرتے تھے۔ ایک طرف ایک جید مولوی صاحب کو تفسیر قرآن کے نکات سمجھاتے تھے تو دوسری طرف کسی دوسرے مولانا کو حدیث نبوی کا درس دیتے ہوئے چند عربی فارسی کے فضیلت خواہ طلاب کے ساتھ ساتھ چند " بالغ العلوم " اور " مالک العلوم " درجات کے

طلبار کی مشکلات کو بھی اسی طرح حل فرماتے جاتے تھے کہ حضرت کا ایک ایک لفظ سننے والوں کے دل و دماغ پر برقی اثر پیدا کرتا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جس ایک بلند درجہ طالبانِ علم کے ساتھ ساتھ ایک جماعت چھوٹے بچوں کی بھی بیٹھی نظر آتی تھی۔ کسی کے ہاتھ میں قاعدہ ابجد ہے۔ کوئی اُردو کی پہلی کتاب سامنے رکھے بیٹھا ہے، کوئی قواعدِ بغدادی اور پارہ عم کی الجھنوں میں گھرا ہُوا ہے ایک درویش صورت بزرگ ہیر وارث شاہ کا کوئی ادق مقام سمجھنے کے لیے چادر میں سر لپیٹے بیٹھے ہیں۔" (نیرنگِ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۰)

سر عبد القادر "بانگِ درا" کے دیباچے میں ان کے متعلق رقمطراز ہیں :

" سیالکوٹ میں ایک کالج ہے جس میں علمائے سلف کی یادگار اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے ایک بزرگ مولوی سیّد میر حسن صاحب علومِ مشرقی کا درس دیتے ہیں۔ حال میں انھیں گورنمنٹ سے خطاب شمس العلمار بھی ملا ہے ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے، اسکی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں۔ اقبال کو بھی ابتدائے عُمر میں مولوی سیّد میر حسن سا اُستاد ملا۔ طبیعت میں علم و ادب سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی، سونے پر سُہاگا ہو گیا۔" (کلیاتِ اقبال صفحہ ۱)

اقبال نے ابتدائی تعلیم مولانا سیّد میر حسن کے مکتب میں پائی۔ مولانا کے مشورے پر ہی انھیں مشن سکول میں داخل کرایا گیا اور وہاں بھی مولانا کے حلقۂ درس میں رہے۔ بی۔ اے کے لیے اقبال کو لاہور آنا پڑا لیکن مولانا سے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہا۔ اقبال جب کبھی موقع پاتے، سیالکوٹ آ کر مولانا سے اپنے شکوک رفع کراتے، مزید سبق لیتے اور غوامض علوم پر اپنے استاد

کی ہدایت و رہنمائی سے غور و فکر کرتے۔

اقبال شعر گوئی کے سلسلہ میں بھی حضرت مولانا سے مشورے لیتے تھے۔ "مثنوی رموزِ بے خودی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

" استاذی علامہ میر حسن صاحب اور مولانا شیخ غلام قادر گرامی شاعر خاص حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ و اجلالہٗ میرے شکریے کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ ان دونوں سے بعض اشعار کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق قابلِ قدر مشورہ ملا۔" (دیباچہ رموزِ بے خودی)

مولانا گرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

" بھلا یہ شعر دیکھئے کیسا ہے:

کم نہ شود خزانۂ مدتِ بے نہایتت
یک دو نفس زیادہ کُن غنچۂ نیم باز را

مقصود یہ ہے کہ تیرے پاس وقت کا ایک لازوال خزانہ ہے پھر غنچہ کی عمر اگر تھوڑی سی زیادہ کر دے تو اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ بہ نظرِ انتقاد ملاحظہ فرمایئے

مولوی میر حسن صاحب کی خدمت میں بھی میں نے یہ شعر سیالکوٹ لکھا ہے۔ دیکھیں ان کی کیا رائے ہے۔" (مکاتیب اقبال بنام گرامی ص۱۶۴)

مولانا سید میر حسن کے متعلق محمد عبد الرحمٰن شاطر مدراسی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

" اگر آپ "اعجازِ عشق" میرے کسی دوست کے نام ارسال کرنا چاہیں تو حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی سکاچ مشن کالج سیالکوٹ کے نام ارسال کیجئے۔ یہ بڑے بزرگ، عالم اور شعر فہم ہیں، میں نے انھیں سے

اکتسابِ فیض کیا ہے"۔ (خطوطِ اقبال ص۴۷)

اسی اکتسابِ فیض کا اعتراف اقبال نے اس شعر میں بھی کیا ہے ؎

مجھے اقبال اُس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

اقبال ہمیشہ ان کی عظمت کا اعتراف کرتے رہے اور اس معاملہ میں حفظِ مراتب سے غافل نہیں ہوئے

فقیر وحید الدین راوی ہیں کہ:

"میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جب مولوی صاحب مرحوم کا ذکر کرتے تھے، ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اسوۂ رسولؐ پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص کا عمل ہے تو وہ مولوی سیّد میر حسن سیالکوٹی ہیں۔ وہ اکثر مولوی صاحب کے ہاں کی پُرلطف صحبتوں کا ذکر کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ان کے ہاں ہمیشہ اہلِ علم کی محفل جمی رہتی تھی اور گھنٹوں مختلف مسائل پر بڑی دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے اُستاد کا جس قدر احترام کرتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انھیں مولوی صاحب کو اپنا کلام سنانے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ کہنے لگے، زندگی بھر میں ان کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا۔ وہ بھی اتفاقی طور پر۔ مولوی صاحب کسی کام کے لیے گھر سے نکلے۔ ایک بچہ جو ان کے عزیزوں میں تھا، اور جس کا نام "احسان" تھا، ان کے ساتھ تھا۔ مولوی صاحب کہنے لگے، اقبال اسے گود میں اُٹھا لو۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ کچھ دور جا کے میں تھک گیا۔ چنانچہ میں نے بچے کو تو ایک دوکان کے تختوں پر کھڑا کر دیا، اور

خود ستانے لگا۔ مولوی صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ ہمیں اپنے ساتھ نہ پایا تو اُلٹے پاؤں لوٹے اور میرے قریب آ کے فرمایا۔ "اقبال! اس کی برداشت بھی دشواری ہے" میری زبان سے بے اختیار نکل گیا ــــ
"تیرا احسان بہت بھاری ہے"۔ (روزگار فقیر جلد اوّل ص ۵۷، ۵۸)

۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے، جب ڈاکٹر صاحب انار کلی والے مکان میں رہتے تھے۔ سیّد محمد عبداللہ ان سے ملنے کے لیے وہاں گئے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے فرمانے لگے:

"عبداللہ جی! یورپ کا کوئی ایسا بڑا عالم یا فلسفی نہیں ہے oriental and occidental مستشرق یا مستغرب جس سے میں نہ ملا ہوں یا کسی نہ کسی موضوع پر بے جھجک بات نہ کی ہو لیکن نجانے کیا بات ہے۔ شاہ جی سے بات کرتے ہوئے میری قوتِ گویائی جواب دے جاتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے کسی نقطۂ نظر سے مجھے اختلاف ہوتا ہے لیکن دل کی یہ بات بآسانی زبان پر لا نہیں سکتا"۔

(روزگار فقیر جلد اوّل ص ۲۰۹)

جب میکلیگن گورنر پنجاب نے حضرت علامہ کو ان کے خطاب کے لیے بلایا تو شمس العلماء کے خطاب کے لیے ان سے کوئی مناسب نام بھی پوچھا۔ حضرت علامہ نے فرمایا" اس شرط پر بتاتا ہوں کہ اس کے بعد کسی اور نام پر غور نہ کیا جائے"۔ گورنر نے پہلے تو کچھ تامّل کیا اور پھر کہا اچھا آپ نام بتائیے۔ علامہ نے اپنے استاد مولانا سیّد میر حسن کا نام لیا۔ گورنر نے کہا، اس سے قبل یہ نام نہیں سُنا۔ اچھا یہ بتائیے کہ انھوں نے کون کون سی کتابیں تصنیف کی ہیں؟ حضرت علامہ نے فرمایا" انھوں نے کوئی کتاب تو تصنیف نہیں کی لیکن میں ان کی "زندہ تصنیف" آپ کے سامنے موجود ہوں جسے گھر بُلا کر "سر" کے خطاب کی پیشکش کی جارہی ہے"۔ علامہ

گورنر پنجاب سے رخصت ہوئے اور چند قدم جا کر پھر واپس آ گئے اور کہا ایک اور شرط قبول کیا ہوں کہ اگر شمس العلماء کے خطاب کی سفارش منظور ہو جائے تو میرے ضعیف العمر اُستاد کو یہ سند لینے کے لیے سیالکوٹ سے لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے۔ یہ شرط بھی منظور ہو گئی چنانچہ مولوی صاحب کے خطاب کی سند ان کے صاحبزادے سیّد علی نقی شاہ کو جو گورنمنٹ ہاؤس میں بطور معالج ملازم تھے گورنر پنجاب نے عطا کی اور انھوں نے سند کو اپنے والد کے پاس سیالکوٹ پہنچا دیا۔

۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو مولانا کا انتقال ہو گیا۔ حضرت علامہ کو اپنے اُستاد کے انتقال کی خبر ملی تو وہ میکلوڈ روڈ والے مکان سے اُسی وقت خبر سنتے ہی ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہُوا کہ سیالکوٹ اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت ایک مال گاڑی وزیر آباد جا رہی تھی۔ حضرت علامہ اسی میں بیٹھ گئے اور وزیر آباد پہنچ کر وہاں سے سیالکوٹ جانے کا بندوبست کیا۔ اقبال نے مولانا کی وفات پر مندرجہ ذیل مادہ تاریخ نکالا

مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

۱۳۴۷ھ

قاضی فضل حق قریشی

اقبال اور مولانا سیّد انور شاہ کشمیریؒ

اقبال کے ہاں مولانا انور شاہ کا ذکر پہلی بار ۱۹۲۸ء کی اورینٹیل کانفرنس کے اجلاس لاہور کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدارتی خطبہ میں آیا ہے جہاں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ انھیں دنیائے اسلام کے جیّد ترین محدثین وقت میں سے کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

مولانا سیّد محمد انور شاہ ۲۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو وادیٔ کشمیر کے علاقہ لولاب کی ایک چھوٹی سی بستی دودھوان میں پیدا ہوئے۔ قرآن اور فارسی کی کچھ کتابیں والد بزرگوار مولانا محمد معظم شاہ سے پڑھیں۔ چودہ برس کی عمر میں تحصیل علم کے لیے کشمیر سے ہزارہ پہنچے اور وہاں کاکول میں قیام کیا۔ کاکول کو اطراف و اکناف ہزارہ میں بیسویں صدی کے ربع اوّل تک تدریسِ فقہ و اصول اور صرف و نحو کے لیے ایک معروف مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت وہاں مولانا فضل الدین مسندِ درس پر فروکش تھے۔ وہ امیر المجاہدین مولانا نصراللہ کے پوتے تھے۔ یہاں سے استفادہ کے بعد ۱۸۹۳ء میں دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور ۱۸۹۷ء میں علومِ متداولہ کی تکمیل سے فارغ ہوئے۔ حدیث کی سند شیخ الہند مولانا محمود حسن سے حاصل کی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی روایت حدیث کی اجازت لی اور ان سے بیعت ہو کر خلیفہ اور مجاز بنے۔

تحصیلِ علم کے بعد درس و تدریس کا شغلہ اختیار کیا۔ ۱۸۹۷ء میں جب مدرسۂ امینیہ کا قیام عمل میں لایا گیا تو صدر مدرس کے لیے آپ ہی کا انتخاب ہُوا۔ ۱۹۰۳ء میں بڑے بھائی کی وفات پر کشمیر گئے تو والدین نے باہر رہنے کی اجازت نہ دی۔ ۱۹۰۶ء میں کشمیر سے حجاز گئے۔ فریضۂ حج ادا کیا اور مصر و شام کے نامور محدثین سے روایتِ حدیث کی اجازت لی... ۱۹۰۹ء میں بارہ مولا میں ایک مدرسہ "فیضِ عام" کے نام سے قائم کیا اور سال بھر یہاں درس دیا۔ ۱۹۱۰ء میں فضلائے دارالعلوم کے جلسہ دستاربندی میں شرکت کے لیے دیوبند گئے تو شیخ الہند نے انھیں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے پر مامور کر دیا۔ عرصہ دراز تک اس خدمت کا معاوضہ قبول نہ کیا۔ شیخ الہند کے زمانۂ اسارت میں دارالعلوم کی مسندِ صدارت پر فائز رہے اور ان کی وفات کے بعد ۱۹۲۶ء تک یہ اعزاز ان کے پاس رہا تاآنکہ وہ دارالعلوم کے منتظمین سے اختلاف کی بنا پر علیحدہ ہو کر ڈابھیل چلے گئے۔ ۱۹۳۲ء تک وہاں درس دیتے رہے۔ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ کو دیوبند میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات پر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے کہا:

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابنِ حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہو رہا ہے"۔ [1]

سید سلیمان ندوی نے لکھا:

"دین و دانش کی دنیا کا مہرِ انور ۳ صفر ۱۳۵۲ھ (۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ یعنی مولانا سید انور شاہ صاحب جانشینِ شیخ الہند و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے

---

[1] سید محمد ازہر شاہ قیصر: حالاتِ زندگی اپنی کتاب "حیاتِ انور" میں۔ ص ۱۔ ۲۹ (دیوبند: ۱۹۵۵ء) ص ۲۱

دو برس کی علالت اور ضعف و نقاہت کے بعد ۷۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔ چین سے لے کر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں لیتا رہا اور ہند اور بیرونِ ہند کے سینکڑوں تشنگانِ علم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔

مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی، جس کی اُوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علوم حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے" [۱]

اقبال اور مولانا انور شاہ کے تعلقات کا آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ء سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی راوی ہیں:

"ہندوستان میں سیاسی طور پر ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلا کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جمعیت العلماء ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے تحت کیا جائے۔ اس کے رُوحِ رواں اور ہردلعزیز مولوی عبد القادر قصوری وکیل تھے۔ اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے بریڈلا ہال میں منعقد ہُوا جو موجودہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے عقب میں ہے۔ راقم نے اتنے علمائے دین کا مجمع پھر نہیں دیکھا اور نہ آج تک پھر ایسا جلسہ ہی ہُوا۔ جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس جلسہ کے افتتاح پر قرأت مولانا طاہر

---

[۱] سلیمان ندوی "شذرات" معارف ۳۲ : ۱ (جولائی ۱۹۳۳ء) ص ۲

دیوبندی نے کی تھی اور صدر مولانا آزاد کی تجویز کی تائید میں کئی علما نے تقریریں
کی تھیں۔ مگر وہ تقریر جو مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا فاخر کانپوری
نے کی تھی وہ ایک شاہکار تھی۔ خطبۂ صدارت کو مولانا آزاد نے خود اور کچھ
حصّہ کو مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی اور کچھ حصّہ کو مولانا عبد الحلیم انصاری نے
پڑھا تھا۔ اسی جلسہ میں اوّل مرتبہ میں نے خود علامہ اقبال اور علامہ سیّد
انور شاہ کشمیری کا تعارف کرایا تھا" [1]

اِس کے بعد اقبال اور مولانا انور شاہ کی متعدد ملاقاتیں رہیں۔ اقبال کی شدید
خواہش تھی کہ لاہور میں کسی مستند عالم کو مستقل قیام کی دعوت دی جائے تاکہ وہ خود اور
اہلِ لاہور اس سے استفادہ کر سکیں۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک لاہور میں ایک متنفس بھی
ضروریاتِ اسلامی سے آگاہ نہیں تھا اور پنجاب علمی طور پر بانجھ تھا۔ اکبر الٰہ آبادی کے نام
ایک خط میں لکھتے ہیں :

"یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں
یہاں انجمن اور کالج اور فکرِ مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں
علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ
اسلامی کی متاع نہیں بکتی" [2]

ایسے میں اقبال کی نظرِ انتخاب برِ عظیم پاک و ہند میں دو شخصیات پر ٹھہری جنھیں
لاہور میں مستقل قیام کی دعوت دی جا سکے۔ ایک "اُستاذ الکل اور علوم اسلام کی جوئے شیر
کا فرہاد" سید سلیمان ندوی اور دوسرے "دُنیائے اسلام کے جدید ترین محدّث وقت" مولانا

---

[1] عبد اللہ چغتائی۔ بادشاہی مسجد لاہور (لاہور، کتاب خانہ نورس، ۱۹۷۲ء) ص ۳۷
[2] شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ حصہ دوم (لاہور، شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱ء) ص ۴۸

سیّد محمّد انور شاہ کشمیری، لیکن بد قسمتی سے دونوں بزرگ لاہور نہ آسکے۔ یہ ۳۱ جنوری ۱۹۲۰ء کی بات ہے جب اقبال نے مولانا انور شاہ کے قیام کے انتظامات کرلیے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ علامہ سیّد انور شاہ صاحب لاہور میں اتفاق سے تشریف لے آئے اور راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں (اندرون موچی دروازہ رنگ محل لاہور) پیر عبدالغفار شاہ ۲ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ کے ہاں مہمان تھے۔ اس وقت ادھر آپ کی موجودگی لاہور میں علامہ اقبال نے ہر دو متذکرہ بالا انجمنوں[1] سے معاملہ فہمی بھی کرلی تھی کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہی مسجد اور ادھر اسلامیہ کالج میں علوم دین اسلام کے سربراہ ہوں گے" [2]

مارچ ۱۹۲۵ء میں جب مولانا انور شاہ انجمن خدام الدین لاہور کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور آئے تو اقبال نے انھیں خط لکھا :

۱۳ مارچ ۱۹۲۵ء [3]

"مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مجھے ماسٹر عبداللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرمائیں گے میں

---

[1] انجمن اسلامیہ پنجاب اور انجمن حمایت اسلام لاہور

[2] عبداللہ چغتائی۔ بادشاہی مسجد لاہور (لاہور: کتاب خانہ نورس، ۱۹۷۲ء) ص ۳۸

[3] "اقبال نامہ" میں ۱۹۳۵ء درج ہے جو درست نہیں۔ یہ ۱۹۲۵ء ہے۔ ۱۹۳۳ء میں مولانا کا انتقال ہوچکا تھا۔

اِسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب، قبلہ عثمانی حضرت مولوی شبّیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہی اِلتماس ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لیے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی" [۱]

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اس ملاقات کی تفصیل لکھتے ہیں:

"مارچ ۱۹۲۵ء میں لاہور میں انجمن خدام الدین کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ ہُوا۔ اس انجمن کے روحِ رواں مولوی احمد علی تھے۔۔۔ جس میں خصوصیت سے علمائے دیوبند نے شرکت کی تھی، جن میں قبلہ سیّد انور شاہ صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا شبّیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے ہاں ایک خاص دعوت رات کے وقت کی تھی جس میں ان تمام علما نے شرکت کی تھی۔ ان میں مرحوم مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی مدعو تھے اور علامہ اقبال کے سامنے اس وقت محض یہ مدِّنظر تھا کہ کسی طرح علامہ سید انور شاہ صاحب کو ان سے استفادہ کرنے کے لیے مستقل طور پر یہاں بُلایا جائے" [۲]

۱۹۲۶ء میں جب مولانا انور شاہ انتظامی اختلافات کی بنا پر دارالعلوم سے علیحدہ

---

[۱] شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ حصہ دوم (لاہور: شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱ء) ص ۲۵۷

[۲] عبداللہ چغتائی۔ بادشاہی مسجد لاہور (لاہور: کتاب خانہ نورس، ۱۹۷۲ء) ص ۳۸

ہوئے تو اقبال کو اس سے خوشی ہوئی۔ شاید اب وہ مولانا کو قیامِ لاہور پر راضی کر سکیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرۃ الاستاذ نے اپنے عہدہ صدرالاساتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا فرمانے لگے کہ آپ کا اور دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفے کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا "کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں"؟ فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دارالعلوم کو تو صدرالمدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی۔ لیکن اسلام کے لیے جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں، اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کے لیے میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالمِ اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سر چشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل

میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟

یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے

فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی" [۱]

اقبال نے سولانا انور شاہ کی علیحدگی پر انھیں ایک تفصیلی تار دیا۔ جناب عبدالرشید

سولانا عبدالحنان ہزاروی کی زبانی لکھتے ہیں :

"جب علامہ شاہ صاحب نے دارالعلوم سے استعفیٰ دے دیا، میں

ان دنوں لاہور آسٹریلیا جامع مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیوبند

ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ اب

آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں۔ جوابی تار تھا، جس کا

کوئی جواب نہ آیا جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو دیوبند بھیجا کہ تم جا کر زبانی

عرض کرو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا

جب ڈابھیل والوں نے اصرار کر کے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند

کر لیا تھا۔ میں ملا تو فرمایا افسوس کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا اور میں ڈابھیل

والوں سے وعدہ کر چکا تھا" [۲]

سولانا انور شاہ لاہور تو نہ آسکے لیکن اقبال ان سے برابر استفادہ کرتے رہے

اپنے سوالات اور شبہات بالتفصیل سولانا کو لکھتے۔ سولانا قاری محمد طیب لکھتے ہیں :

"ان کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شبہات سے پر آتے تھے

---

[۱] سعید احمد اکبر آبادی۔ "اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم" باب ۶ در حیات انور۔ مرتبہ:
سید محمد ازہر شاہ قیصر (دیوبند ۱۹۵۵ء) ص ۶۵

[۲] عبدالرشید ارشد۔ بیس بڑے مسلمان (لاہور، مکتبۂ رشیدیہ، ۱۹۷۱ء) ص ۳۷۷

اور حضرت ان کے شافی جوابات لکھتے۔ [1]

افسوس کہ ان دونوں بزرگوں کی خط و کتابت محفوظ نہیں۔

مولانا انور شاہ کا رسالہ "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" چھپا تو اس کا ایک نسخہ اقبال کو بھی بھیجا۔ یہ چار سو اشعار کا منظوم رسالہ ہے جس میں علم کلام و فلسفہ کے معرکۃ الآرا موضوع، "حدوث عالم" پر دلائل و براہین قائم کیے ہیں۔ اقبال نے اسے بہت پسند کیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت اُستاذ کا ایک منظوم رسالہ حدوثِ عالم کی بحث پر ہے۔ یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اس کا ایک نسُخہ حضرۃ الاستاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی تحفۃً ارسال فرمایا۔

ایک صحبت میں فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال رسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوثِ عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے، حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔" [2]

مسئلہ زمان و مکان ایک عرصہ تک اقبال کے مطالعہ کا محور رہا اور اس ضمن میں مولانا

---

[1] محمد طیب "نور الانوار" بابِ درحیاتِ انور، مرتبہ سید محمد ازہر شاہ قیصر (دیوبند ۱۹۵۵ء) ص ۲۲۵

[2] سعید احمد اکبر آبادی "اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم" بابِ درحیاتِ انور، مرتبہ سید محمد ازہر شاہ قیصر (دیوبند: ۱۹۵۵ء) ص ۱۶۳، ۱۶۴

سید انور شاہ سے رجوع کیا۔ اقبال ۱۹۲۸ء میں اورینٹیل کانفرنس لاہور کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدارتی خطبے "حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت" میں لکھتے ہیں :

"لیکن جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ میں دھر (بمعنی TIME) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولوی سید انور شاہ صاحب سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثینِ وقت میں سے ہیں، میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر ازراہِ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی۔" [1]

اقبال نے اپنے خطبات (THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) کے سلسلے میں مولانا سید انور شاہ سے ختمِ نبوت، قتلِ مرتد اور مسئلہ زمان و مکان کے بارے میں بالخصوص استفادہ کیا۔

اقبال اور مولانا انور شاہ کی آخری ملاقات اگست ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ مولانا مقدمہ بہاولپور کے سلسلہ میں ۱۹ اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور پہنچے۔ ۲۵ اگست کو ان کا بیان شروع ہوا جو متواتر پانچ روز تک جاری رہا۔ اسی سفر کے سلسلہ میں لاہور میں دو روز قیام کیا۔ جامع آسٹریلیا میں صبح کی نماز کے بعد وعظ کرتے جس میں دیگر لوگوں کے علاوہ اقبال بالخصوص حاضر ہوتے [2]۔ یہ سفر مولانا نے بیماری کے دوران میں کیا۔ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو دیوبند میں اُن کا

---

[1] بشیر احمد ڈار۔ انوارِ اقبال (کراچی : اقبال اکیڈمی، ۱۹۶۷ء) ص ۲۵۵۔ [2] محمد انوری "حضرۃ الاستاذ محدث کشمیری" باب ۱۳ در حیات انور، مرتبہ سید محمد ازہر شاہ قیصر (دیوبند : ۱۹۵۵ء) ص ۳۲۷

انتقال ہوگیا۔

مولانا انور شاہ کی وفات پر مسلمانان لاہور کا ایک تعزیتی اجتماع ہُوا۔ اس سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے مولانا کو یوں خراج عقیدت پیش کیا :

" اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے" [1]

کتابیات

(۱) ارشد، عبدالرشید۔ بیس بڑے مسلمان، لاہور : مکتبہ رشیدیہ ، ۱۹۷۱ء

(۲) ڈار، بشیر احمد۔ انوار اقبال، کراچی : اقبال اکیڈمی ، ۱۹۶۷ء

(۳) عطاء اللہ، شیخ۔ اقبال نامہ، حصہ دوم، لاہور : شیخ محمد اشرف ، ۱۹۵۱ء

(۴) قیصر، محمد ازہر شاہ۔ حیات انور، دیوبند : ۱۹۵۵ء

(۵) چغتائی، عبداللہ ڈاکٹر۔ بادشاہی مسجد لاہور۔ لاہور : کتاب خانہ نورس، ۱۹۷۲ء

(۶) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۳۳ء

(مطبوعہ "اقبال" لاہور)

---

[1] عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان (لاہور : مکتبہ رشیدیہ ، ۱۹۷۱ء) ص ۳۷۵

جناب مولانا محمد صاحب انوریؒ

حضرت علامہ انور شاہؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ

بزم اقبال لاہور نے راقم الحروف سے فرمائش کی تھی کہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری اور حکیم مشرق ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کے باہمی تعلقات کے متعلق ایک تحریر مرتب کروں جسے بزم مذکور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی تاریخ حیات میں شامل کرے گی۔ خاکسار اپنے مشاغل کی وجہ سے اس فرمائش کی تعمیل نہیں کر سکا۔ لیکن اس ضرورت کی اہمیت کا اندازہ کر کے میں نے اپنے بزرگ جناب مولانا محمد صاحب انوری سے، جو حضرت علامہ کشمیری کے تلمیذِ خاص اور حرفِ اقبال کے قدر شناس ہیں، درخواست کی وہ اس طرح کی ایک یادداشت مجھے ارسال فرمادیں، جسے میں بزم اقبال تک پہونچا دوں گا، مولانا نے اس سلسلہ میں مختصر سی جو تحریر بھیجی ہے اگرچہ وہ ایک اجمال ہے جو اپنی شرح و تفصیل کا محتاج ہے لیکن جو کچھ ہے اس سے عالم اسلام کی ان دو بڑی شخصیتوں کے باہمی تعلقات پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے، میں اس تحریر کو قارئین رسالہ دارالعلوم کی دلچسپی کے لیے ان کی خدمت میں حاضر کرتا ہوں۔ (سید محمد ازہر شاہ قیصر)

مولانا حبیب الرحمٰن ملی فاضل دیوبند فرماتے ہیں کہ جب ۱۹۲۲ء میں میرا قیام لاہور میں تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی خدمت میں اکثر آنا جانا رہتا تھا بعض مسائل کلامیہ پر

گفتگو ہوتی رہتی تھی تو میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں عرض کرتا۔ ہمارے استاذ حضرت مولانا سیّد محمّد انور شاہ صاحبؒ سے اس کی پوری تحقیق ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو حضرت کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہُوا۔ انہی ایّام میں انجمن خدام الدّین کا سالانہ اجلاس شیرانوالہ گیٹ لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب مدظلہٗ کے زیرِ اہتمام منعقد ہُوا جس میں اکابرِ دیوبند کے علاوہ اکنافِ ہند سے جلیل القدر علماء دین داعیانِ امّت تشریف لائے مولانا حسین علی صاحب ںیانوالی اور حضرت مولانا غلام محمّد صاحب خانپوری رحمہما اللہ تعالےٰ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، اہلِ لاہور کے لیے بزرگانِ دیوبند کی تفصیلی زیارت کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ سر محمّد شفیع مرحوم و ڈاکٹر سر محمّد اقبال مرحوم نہایت اہتمام سے شرکت فرماتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے حضراتِ دیوبند کی خصوصی دعوت کا انتظام اپنی کوٹھی پر کیا۔ اور نہایت اہم مباحثِ مختلفہ پر تبادلۂ خیالات کیا۔ حضرت شاہ صاحب قدس اللہ اسرارہم کے جوابات سے نہایت محظوظ و مسرور ہُوئے تاآنکہ ہر مجلس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زبان پر حضرت شاہ صاحبؒ کے کمالاتِ علمیہ و عملیہ کا ذکر آنے لگا۔ مدراس کے لیکچروں کی ترتیب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کی راہنمائی میں ہوئی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اسی مجموعہ کی ابتداء میں اس امر کا برملا اعتراف فرمایا ہے کہ مولانا محمّد انور شاہ صاحب میرے اس میں رہنما ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی نہایت بلیغ عربی ادبی نظم ضرب الخاتم علی حدوث العالم جس میں مادہ کا ابطال اور مادیین کی رائے کا ردّ فرمایا گیا ہے اور اثبات وجود باری تعالیٰ پر پندرہ دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ اور قدرت باری تعالیٰ کے اثبات پر بحث فرماتے ہُوئے ملاحدہ جدید و قدیم کے اقوال کا تہافت ثابت فرمایا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم نے یہ رسالہ ڈاکٹر صاحب کو ہدیۃً عنایت فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس دقیق عربی نظم کا نہایت دقّتِ نظر سے مطالعہ فرمایا

اور جس مقام کے حل میں اشکال پیش آیا دیوبند، ڈابھیل خطوط لکھ لکھ کر حضرت شاہ صاحب مرحوم سے حل کرایا۔ مدّت تک باہمی مراسلت ومکاتیب کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت نے بعض فارسی طویل مکتوب تیس تیس صفحات کے ڈاکٹر صاحب کو لکھے ہیں۔ کاش یہ مکاتیب اگر شائع ہو جاتے تو ایک بڑا علمی ذخیرہ اصحاب ذوق کے ہاتھ آجاتا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری اس نظم کو جیسا ڈاکٹر اقبال صاحب سمجھے ہیں کوئی عالم دین نہیں سمجھا۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام کانفرنس علوم مشرقیہ کے انعقاد کا اعلان ڈاکٹر صاحب مرحوم کی صدارت[1] میں ہوا۔ علوم مشرقیہ کے ماہرین بنگال، آسام، کراچی بلوچستان، علی گڑھ، دہلی، بمبئی، پشاور، بہاولپور غرض قدیم انڈیا کے گوشے گوشے سے جمع ہوئے۔ یورپین مستشرقین بھی شامل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بلیغ خطبہ[2] مسلمانوں کی خدمات علوم وفنون پر انگلش زبان میں پڑھا۔ مختلف علوم وفنون کی جو کچھ خدمات علماء اسلام نے انجام دی ہیں ذکر فرماتے ہوئے ائمۂ علوم وفنون کی ایک طویل فہرست پڑھی، اس سلسلے میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کا بھی تفصیلی تذکرہ آیا۔ چونکہ احقر بھی اس کانفرنس میں مدعو تھا۔ اپنے احباب کو خصوصی توجہ دلائی کہ خود ڈاکٹر صاحب سے یا دوسرے کسی فاضل سے اس کی پوری توضیح کرائی جائے چنانچہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے ایک پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب کے احسان کا ڈاکٹر صاحب اس سلسلے میں ذکر فرما رہے تھے کہ انھوں نے ایک مجلس میں حضرت شاہ صاحبؒ سے زمان ومکان کی تحقیق کے متعلق استفسار فرمایا تو حضرت نے اس پر ایک مبسوط تقریر فرمانے کے بعد علامہ عراقی رحمہ اللہ تعالیٰ کے رسالہ (فارسی) غایۃ البیان فی تحقیق الزمان والمکان

---

[1] اقبال اس کے عربی وفارسی شعبے کے صدر تھے۔

[2] خطبے کا عنوان تھا "حکمائے اسلام کے عمیق ترمطالعے کی دعوت"۔

کی طرف متوجّہ فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے تھے کہ میں نے شاہ صاحب سے عرض کی کہ یورپین محققین نے اس کی پوری تحقیق کی ہے چنانچہ نیوٹن پہلا محقّق ہے جس نے اس پر بسط سے بحث کی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے نیوٹن کی بیس کے قریب تصانیف دیکھی ہیں، زمان و مکان پر جو کچھ لکھا ہے وہ علامہ عراقی کے مذکورۃ الصدر رسالہ سے لیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی متعجّب ہوئے اور اس رسالہ کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ حضرت نے دیوبند جا کر وہ رسالہ ڈاکٹر صاحب کے پاس ارسال فرما دیا۔

قادیانیوں کے خلاف بہاولپور کے تاریخی مقدمہ میں احقر بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھا اور حضرت نے احقر کو مختار مقدمہ بنوایا تھا اور تین ہفتے حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ ایک مجلس میں احقر نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اس خطبۂ صدارت کا تذکرہ کیا تو حضرت نے تفصیل کے ساتھ یہ قصّہ بیان فرمایا۔ یہ بھی فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ مجھے واپس نہیں دیا اور اس نے دوبارہ مطالعہ بھی نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سے اس قدر شغف اور تعلق ہو گیا تھا کہ حضرت سے ملاقات کا ہر وقت اشتیاق لگا رہتا تھا۔ مقدمہ بہاولپور کے سفر میں جب کہ احقر بھی ہمراہ تھا لاہور ورود ہوا آسٹریلیا بلڈنگ میں قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو جب میزبان کی طرف سے اطلاع پہنچی فوراً کار سے تشریف لائے، کئی گھنٹے مختلف مسائل میں حضرت سے استفادہ فرماتے رہے۔ اکثر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ پھر وصال سے چند ایام قبل جب لاہور تشریف لے گئے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے خود قیام کا انتظام کرایا۔ اپنے احباب سمیت ہر وقت حاضر خدمت رہتے تھے۔ حضرۃ کی مجالس میں اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو حاضر ہونے کی دعوت دیتے۔ پھر برکت علی محمڈن ہال میں اپنے اہتمام سے جلسہ کا انعقاد کیا۔ ختمِ نبوّت اور ردِّ قادیانیت پر حضرت کا بیان ہوا

ڈاکٹر صاحب پر اس قدر اثر ہوا کہ ردِ قادیانیت کے لیے کمر بستہ ہو گئے

ڈاکٹر صاحب کا آخری دور کا کلام نظم و نثر اُردو و فارسی ان حقائق کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ردِ قادیانیت میں نہایت بلند پایہ مضامین سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور سے انجمن کے کالج اور تمام سکولوں سے قادیانی لاہوری تمام ملازمین برطرف کرائے۔ یہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی کھلی کرامت ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس کی سعی فرماتے رہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو لاہور لایا جائے۔ فرمایا کرتے تھے۔ دیوبند میں بعض جزوی اختلافات کے رونما ہونے کو ہم اپنے لیے نیک فال سمجھتے ہیں۔ یہ تو احقر کے سامنے لاہور میں حضرت سے عرض کرتے تھے کہ میں نے اپنی ذاتی سعی سے احباب کو کئی ہزار کی رقم جمع کرنے کے لیے کہا ہے کہ جناب کے لیے ایک کوٹھی تعمیر کرائی جائے اور کتب مہیا کی جائیں تاکہ آپ کی ذات سے قدیم و جدید تعلیم یافتہ حضرات استفادہ کریں اور مسائل جدیدہ جس قدر سامنے آ رہے ہیں، ان کے حل کی کوشش کی جائے اور علم الفقہ کی از سرِ نو ترتیب دی جائے۔

حضرت شاہ صاحب مرحوم لاہور کے آخری سفر میں رسالہ خاتم النبیین کا مسوّدہ ساتھ لے گئے تھے۔ اس کے بعض مقامات ایک مجلس میں سنائے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت محظوظ ہوئے اپنے دوستوں کو بلا بلا کر لائے اور بار بار سنانے کا تقاضا کرتے۔

حضرت کے وصال کی خبر لاہور میں سن کر ڈاکٹر صاحب بیحد مغموم ہوئے۔ تعزیتی جلسہ اپنے اہتمام سے کرایا۔ خود صدارتی تقریر میں بھرائی ہوئی آواز میں جو الفاظ فرمائے۔ فضا میں اب تک گونج رہے ہیں۔ فرمایا "مولانا محمد انور شاہ صاحب کی مثال پیش کرنے سے اسلام کی پانچ سو سال کی تاریخ عاجز ہے"

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبالؔ)

حضرت شاہ صاحب مرحوم، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے فقر منشی کے مداح تھے اور شاعر حکیم اور عارف مانتے تھے۔ حضرۃ شاہ صاحب کی صحبتِ مبارکہ نے یہ اثر کیا کہ آخری عمر میں ڈاکٹر صاحب کے اوقات تلاوتِ قرآن مجید اور رقت میں گذرتے تھے۔

(مطبوعہ "دارالعلوم" دیوبند)

جناب سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰن صاحب

اقبالؒ اور سیّد سلیمان ندویؒ

یہ مضمون اخبار چٹان لاہور کے اقبال نمبر میں شائع ہُوا تھا اور ہندوستان میں بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا تھا، اس لیے حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدتمندوں کی جن میں ناظرین معارف بھی ہیں، خواہش تھی کہ اس کو معارف میں بھی شائع کیا جائے۔ یہ مضمون بہت سے علمی و دینی فوائد پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس کی اشاعت مفید معلوم ہوئی۔ ’م‘

مجھ کو دارالمصنّفین کے احاطہ میں اسی مکان میں رہنے کا فخر حاصل ہے — جس میں استاذی المحترم حضرت سیّد سلیمان ندویؒ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہا کرتے تھے اسلیے وہ میری نگاہوں میں ہر لمحہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ اس مکان سے جب دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں آتا ہوں تو ان کی وہ میز رکھی ہوئی نظر آتی

ہے جس پر وہ بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے، اس میز کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ معلوم نہیں اس میز پر سے اسلامی علوم و فنون کے کتنے سرچشمے پھوٹے اور بہے اور پھر یکایک ڈاکٹر اقبالؒ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے حضرت سید صاحبؒ کو "علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد" کہا تھا، اس طرح اکثر و بیشتر حضرت سید صاحبؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ دونوں ایک ساتھ نظروں کے سامنے آجاتے ہیں، دونوں اپنے اپنے فن کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں لذت محسوس کرتے رہے جو دونوں کی پاک طینت اور بلند سرشت کی دلیل ہے اسی کی جھلکیاں اس مضمون میں نظر آئیں گی، اس میں زیادہ تر اقتباسات ہی ہیں لیکن ان کو نقل کرتے وقت مجھ کو بڑی لذت محسوس ہوئی، امید ہے کہ وہی لذت ناظرین کو بھی ہوگی۔

ڈاکٹر اقبال کو حضرت سید صاحبؒ سے شروع ہی سے قلبی لگاؤ رہا، اسلیے ۱۹۱۶ء میں اورنٹیل کالج لاہور میں فارسی کے ایک استاد کی جگہ خالی ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا کہ اگر وہ اس جگہ کو پسند فرمائیں تو قبول کرلیں کیونکہ اُن کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لیے مفید ہوگا، لیکن حضرت سید صاحبؒ نے دارالمصنفین سے علیحدہ ہونا پسند نہیں فرمایا اور جب انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ لکھ بھیجا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کے کام میں برکت دے اور ان کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے (۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء) اور پھر ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ جو کام وہ کر رہے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ اور اس کے رسول ان کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔ (۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء)

۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر صاحب کی مشہور کتاب "رموز بیخودی" شائع ہوئی تو انھوں نے حضرت سید صاحبؒ کو اس کا ایک نسخہ بھیجا، جس کو پڑھ کر حضرت سید صاحبؒ بہت

متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اپریل ۱۹۱۸ء کے "معارف" میں ایک طویل ریویو میں کیا، جس میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ مولوی رومی نے سات دفتروں میں سات آسمانوں کے خزانے یکجا کر دیے اس لیے اہلِ معنی میں اس کی بے انتہا مقبولیت ہوئی، ضرورت تھی کہ ہمارے اہلِ دل شعرا مثنوی مولوی روم کا ایک دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کر دیں، شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کے لیے چن لیا، انھوں نے اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں، اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی ان دونوں مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے حضرت سید صاحب نے لکھا کہ رموزِ بیخودی میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے اسرارِ خودی سے بہتر ہے اور اصل معنی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں بظاہر سیاست بیشتر اور اس میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں لیکن منزلِ مقصود ایک ہے، اسی سلسلہ میں سید صاحب رقمطراز ہیں کہ "اس وقت مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں ان میں حکمائے ملت مسلمانوں کے مزاج قومی کی تشخیص نہیں کرتے، مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے وہ صرف تین شخص ہیں، مولانا شبلی نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابوالکلام نے مجلدات الہلال میں اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی دو مثنویوں میں، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستے اوروں پر بھی مکشوف ہو رہے ہیں"۔ حضرت سید صاحب رموزِ بےخودی کی جابجا تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق فلسفیانہ تشریح کے ساتھ صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبال نے اس میں جو اسرار و نکات حل کیے ہیں انکی بنیاد پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فنِ قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید کلام کی ایک بہترین کتاب ہے، اس کے اندر توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پُراثر اور

تشفّی بخش دلائل موجود ہیں۔

حضرت سیّد صاحبؒ نے اس مثنوی کی زبان پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ریویو کے آغاز میں انھوں نے لکھا کہ ابتدا سے ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفریں واقع ہوئی ہے، کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لیے انھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں نظمیں لکھیں لیکن پھر وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے بلکہ ان کی حیثیت ایک عام اُردو شاعر کے خیالات موزوں کی رہ گئی۔" آگے چل کر سیّد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو اُن شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلہ میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پرواہ نہیں کرتے لیکن حق یہ ہے کہ اس کی ایک لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں، مصرعوں کے دروبست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرعہ ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر ونشتر بن کر سُننے والوں کے دل و جگر میں نہ اُتر جائے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفہ، تصوّف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں، اس لیے اختلاف مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا۔" آخر میں حضرت سیّد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں "ایک بالغ نظر اس مثنوی میں الفاظ کی صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کر سکتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے، اس لیے اس تقریظ میں اُن کی طرف توجہ نہیں کی گئی، نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی، اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہیے اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے"۔

معارف کا یہ ریویو ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گذرا تو اپنی فراخدلی، سیر چشمی اور بلند نظری کی بنا پر حضرت سیّد صاحبؒ کو لکھا کہ "آپ کا ریویو نظر سے گذرا ہے جس کیلیے سراپا سپاس ہوں، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے، اللہ تعالی آپکو جزائے خیر دے۔" اور پھر حضرت سیّد صاحبؒ نے ان کی زبان کے متعلق جو کچھ اشارہ کیا تھا، اس سے اختلاف یا تکدّر کا اظہار کرنے کے بجائے یہ تحریر کیا کہ "صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، ضرور صحیح ہوگا، لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا، اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے تاکہ دوسرے اڈیشن میں انکی اصلاح ہو جائے، غالباً آپ نے رموزِ بے خودی کے صفحات پر ہی نوٹ کیے ہوں گے اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجیے میں دوسری کاپی اس کے عوض بھجوا دوں گا۔ اس تکلیف کو میں احسان تصوّر کروں گا۔" (مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۱۸ء)

ان سطروں میں کتنی خاکساری اور فروتنی تھی، حضرت سیّد صاحبؒ کئی مہینے تک ڈاکٹر اقبال کے تسامحات کی نشاندہی کرنے سے گریز کرتے رہے لیکن ڈاکٹر اقبال کا اصرار بڑھا تو اُنھوں نے ان فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی، افسوس ہے کہ حضرت سیّد صاحبؒ کے وہ مکاتیب سامنے نہیں ہیں جو انھوں نے ڈاکٹر اقبال کو لکھے لیکن اقبال نامہ میں ڈاکٹر صاحبؒ کے جو خطوط ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سیّد صاحبؒ نے جن تسامحات کی طرف توجہ دلائی تھی اُن سے اکثر و بیشتر سے ڈاکٹر اقبال کو اتفاق نہ تھا اور انھوں نے بہت سے اساتذہ کی سند پیش کر کے سیّد صاحبؒ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے اور غالباً سیّد صاحبؒ بھی مطمئن ہو گئے تھے لیکن ڈاکٹر اقبال اپنی عالی ظرفی سے ان کو برابر لکھتے رہے کہ میری خامیوں سے ضرور ضرور آگاہ کیا کیجیے، آپ کو زحمت تو

ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا۔" (مورخہ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء) اور پھر اپنی شاعری کے مطمحِ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں کہ "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کیلیے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس اس بات کو مدّنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں اُن کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصوّر نہ کریں (۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء) اور پھر اپنی عالی ظرفی اور خاکساری کا ثبوت یہ لکھ کر دیتے ہیں کہ میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے لیے سید سلیمان کا دل و دماغ صرف ہو، لیکن اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے، اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے، مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا (۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء) غالباً ایسی کوئی تحریر ڈاکٹر اقبال کے قلم سے نکلنے نہ پائی۔

حضرت سید صاحبؒ اور ڈاکٹر اقبال کی یگانگت و موانست بڑھتی گئی اور دونوں باہمی قلبی لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے علمی قدردان بھی ہوتے گئے حضرت سید صاحبؒ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت سے سفر یورپ سے واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا "آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گذاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربارِ نبویؐ سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا (۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء) پھر حضرت سید صاحبؒ نے اسی سال ان کو اپنی کتاب سیرۃ عائشہؓ بھیجی تو ڈاکٹر صاحب نے ایک مکتوب میں لکھا "سیرۃ عائشہ کے لیے سراپا سپاس ہوں یہ

ہدیۂ سلیمانی نہیں سُرمہ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہُوا، خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے" (۲۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر اقبال کی اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن نے کیا تو اس ترجمہ پر سیّد صاحبؒ نے ایک تقریظ مارچ ۱۹۲۱ء کے "معارف" میں شائع کی، جس میں وہ لکھتے ہیں: "اقبال کی زبان غالباً بیس برس سے ہندوستان میں زمزمہ پرواز ہے، ہمارے نوجوان کے کان اس کی سامعہ نوازی سے بہت کچھ لذت گیر ہوئے ہیں لیکن اب تک اس کی قدردانی کا کافی صلہ مصنّف کو ہم نے ادا نہیں کیا" اسی زمانہ میں سیّد صاحبؒ یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تھے، اسی لیے لکھتے ہیں کہ پیرس میں جب ہماری ملاقات ذکاء الملک سابق وزیر تعلیمات ایران اور علامہ محمد عبدالوہاب قزوینی (مشہور ایرانی عالم اور صاحب قلم) سے ہوئی اور اُمم اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کا ذکر آیا تو ہم نے اقبال کے فلسفہ کا ذکر کیا اور محترم محمّد علی نے رموزِ بے خودی اور اسرارِ خودی کا اپنا نسخہ ان کے مطالعہ کو عنایت کیا وہ دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے، اس وقت مجھے نظر آیا کہ ان کی فارسی زبان نے اُن کے دائرۂ اثر کو کتنا بڑھا دیا ہے": پروفیسر نکلسن نے اسرارِ خودی کی نظم کا ترجمہ نظم کے بجائے نثر میں کر دیا ہے، سیّد صاحبؒ نے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہُوئے لکھا کہ اس سے ڈر ہے کہ شاعری کی لطافت دُور ہو کر یہ مثنوی دوسری زبانوں میں فلسفہ کی کوئی بوجھل کتاب نہ بن جائے۔

۱۹۲۲ء میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ڈاکٹر اقبال نے اپنی مشہور نظم خضرِ راہ پڑھ کر سُنائی تو یہ نظم چھپ کر عام نہیں ہونے پائی تھی کہ حضرت سیّد صاحبؒ نے اس کے کچھ بند مئی ۱۹۲۲ء کے معارف میں شائع کیے اور اس پر شرح میں جو تحریر لکھی اس کے کچھ حصّے یہ ہیں: "ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم گو جوشِ بیان میں اُن کی پچھلی

نظموں سے کم ہے لیکن اسی حیثیت سے تعقید اور فارسیت میں بھی کمی ہے۔ ان کی شاعری کا اصلی جوہر فلسفہ اور تخیّل کی مصالحانہ آمیزش ہے اور ان کی یہ خصوصیت اس نظم میں بھی نمایاں ہے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے جب یہ نظم جلسہ میں پڑھنا شروع کی تو مجلس پر ایک سماں بندھ گیا، اکثر مصرعوں پر سامعین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن نظم کے دو مصرعوں نے خود شاعر کی آنکھوں کو اشکبار کر دیا۔

ع بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ

ع ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو

اور پھر سیّد صاحب نے لکھا کہ ہم کو اس نظم کے جس شعر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے :-

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ایسی ہے کہ اس کی شرح لکھنی چاہیے"۔

اور جب یہ تحریر ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گذری تو انھوں نے حضرت سیّد صاحبؒ کو لکھا کہ "خضرِ راہ" کے متعلق آپ نے جو نوٹ لکھا اس کا شکریہ قبول فرمائیے، جوشِ بیان کے متعلق آپ نے جو نوٹ لکھا ہے وہ صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا۔ (کم از کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری اُن کا تجربہ اور واقعات و حوادثِ عالم پر ان کی نظر، ان سب باتوں کے علاوہ ان کا اندازِ طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے، اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیّل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو، اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہُوا تھا اور جناب خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصّہ بن جائیں گے"۔ (۲۹ مئی ۱۹۲۲ء) ان سطروں سے ڈاکٹر اقبال کی بالغ نظری

اور باریک بینی کا صحیح اندازہ ہوگا۔

پھر معارف کی اسی اشاعت میں حضرت سیّد صاحبؒ نے ڈاکٹر اقبال کی "پیامِ مشرق" کی ترتیب کی خبر یہ لکھ کر دی کہ "ہم ناظرین کو ایک اور خوشخبری سنانا چاہتے ہیں، ڈاکٹر اقبال ملک کے ان پُرشور ایّام میں خاموش نہیں رہے ہیں، جرمنی کے ایک شاعر گوئٹے نے اپنے جس مجموعۂ اشعار کا نام مشرقی دیوان رکھا ہے، مغرب کا مشرق پر اب تک یہ قرض چلا آتا تھا، ہمارا مشرقی شاعر اب اس قرض کے بار سے مشرق کو سبکدوش کرنا چاہتا ہے، جب ڈاکٹر صاحب کے والانامہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے گوئٹے کے جواب میں فارسی اشعار کا ایک مجموعہ لکھا ہے جو عنقریب شائع ہوگا، اس کے دیباچہ میں ڈاکٹر اقبال یہ دکھائیں گے کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے، ابھی گذشتہ اورئنٹیل کانفرنس کلکتہ میں ڈاکٹر جیون جی جمشید نے تقریباً اس موضوع پر ایک مضمون پڑھا تھا، اُمید ہے کہ ڈاکٹر اقبال کا قلم ان سے زیادہ سیراب کُن ہوگا"۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریر پڑھی تو حضرت سیّد صاحبؒ کو لکھا کہ پیامِ مشرق پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں، پروفیسر نِکلسن کا خط آیا ہے، انھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے مگر میرے لیے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابلِ افتخار ہے"۔ (۵ جولائی ۱۹۲۲ء)

اقبال نامہ میں حضرت سیّد صاحبؒ کے نام سے ڈاکٹر صاحب کے جو خطوط ہیں، اُن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گو ڈاکٹر صاحب علم و فلسفہ کے پہاڑ اور سمندر بنتے چلے جارہے تھے لیکن کسی حال میں بھی اپنے علم کی بلندی اور گہرائی کا اظہار پسند نہیں کرتے تھے بلکہ جب ضرورت ہوتی تو اپنی عالمگیر شہرت اور عظمت کا خیال کیے بغیر حضرت سیّد صاحبؒ سے علمی و مذہبی استفسارات کرنے میں مطلق نہیں ہچکچاتے تھے انھوں نے جو جو سوالات کیے ان کو سنہ وار مرتب کردیا جائے تو ان سے ان کے ذہنی تجسّس اور تفحص

کے ساتھ ان کے ذہنی ارتقا کا بھی اندازہ ہوگا، اسی غرض سے یہ تمام استفسارات یہاں پر درج کیے جا رہے ہیں :

"دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلا کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لے آتے ہیں، یہ ہدایا فیس مقرّرہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں، کیا یہ مال مسلمان کے لیے حلال ہے؟" (۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء)

یہ معلوم کر کے تعجّب ہوا کہ حمیرا والی سب احادیث موضوعات میں ہیں، کیا کلمینی یا حمیرا بھی موضوع ہے، کمال کا شعر کیا مزے کا ہے۔

اس تصرف ہائے من در شعر من   کلمینی یا حمیرائے من است۔ (۲۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

کیا حکمائے صوفیہ اسلام میں کسی نے زمان و مکان کی حقیقت پر بحث کی ہے ؟ (۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

دو باتیں دریافت طلب ہیں : (۱) متکلمین میں سے بعض نے علم مناظرہ و مرایا کے رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خُدا تعالیٰ کی رویت ممکن ہے، یہ بحث کہاں ملے گی، مَیں اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہُوں۔ (۲) مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود   رحمۃ للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت داں کہتے ہیں کہ بعض سیّاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے، اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے، اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے، شیخ اشراق تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے، ان کے اس عقیدہ کی وجہ یہی تو نہ تھی ؟ (۲۰ اپریل ۱۹۲۲ء)

مردان خدا خدا نباشند　　　　لیکن ز خدا جدا نباشند

کس کا شعر ہے، ایک امر کے لیے اس کی تحقیق ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ کی نظر سے کسی تذکرہ میں یہ شعر گذرا ہو۔ (۳ اگست ۱۹۲۲ء)

مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کا رسالہ تحقیق زماں مطبوعہ ہے یا قلمی؛ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریتاً ملے گا۔ علیٰ ہذا القیاس مولانا شاہ اسمٰعیل کی عبقات، قاضی محبّ اللہ کی جوہر الفرد اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی ...... جن کتابوں کا آپ نے اپنے والا نامہ میں ذکر فرمایا ہے، کیا آپ کے کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہیں؟ اگر ہوں تو میں چند روز کے لیے وہیں حاضر ہو جاؤں اور آپ کی مدد سے ان میں سے بعض کو دیکھ سکوں ...... حضرت ابن عربی کے بحث زماں کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہو گی...... (۲۲ اگست ۱۹۲۲ء)

آپ حضرت اویس اور ان تمام صوفی روایات کے متعلق جو ان سے منسوب ہیں، پکا خیال رکھتے ہیں۔ اگر امام مالک کی تحقیق زیرِ نظر ہو تو ازراہِ عنایت حوالے سے آگاہ فرمائیے گا۔ (۲۳ جنوری ۱۹۲۴ء)

مسلمانوں نے منطق استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو جو اضافے انھوں نے یونانیوں کی منطق پر کیے ہیں اس کے متعلق میں کچھ تحقیق کر رہا ہوں، میں آپ کا نہایت شکرگذار ہوں گا اگر ازراہِ عنایت اپنی وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں، کم از کم ان مقالوں کے نام تحریر فرمایئے جن کو پڑھنا ضروری ہے ..... (یکم فروری ۱۹۲۴ء)

کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبد الوہاب نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی؟ اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے۔ مفتی عالم جان جن کا حال میں انتقال ہو گیا ہے، ان کی تحریک کی اصل غایت کیا تھی؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصود

ایک مذہبی انقلاب بھی تھا ؛ تکلیف دہی کے لئے معافی چاہتا ہوں اور یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ اس عریضہ کا جواب جہاں تک ممکن ہو جلد دیجیے" (یکم مئی ۱۹۲۴ء)

" حال میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام "مسلمانوں کے نظریہ متعلقہ مالیات" ہے، اس کتاب میں لکھا ہے، اجماع اُمّت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے ..... اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے" (۸ اگست ۱۹۲۴ء)

" آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فقہا نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز رکھی ہے ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہے تو اس سے آگاہ فرمائیے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماع صحابہ ہی کر سکتا ہے یا علمائے مجتہدین امّت بھی کر سکتے ہیں ...... کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نص قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کون سا حکم ہے" ..... (۲۷ اگست ۱۹۲۴ء)

" آپ نے کسی گذشتہ خط میں مجھے لکھا تھا کہ حضور سرورِ کائنات سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے، اگر وحی نازل ہوتی تو اُس کے مطابق مسائل کا جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے ..... اس کا حوالہ کون سی کتاب میں ملے گا ؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول سے آپ نے لیا ہے" ؟ (۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء)

" آیۂ توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے آیۂ وصیت پر بھی جو ارشادات ہیں میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس زحمت کیلیے معافی چاہتا ہوں، جب فرصت ملے جزئیات سے بھی آگاہ فرمائیے۔ اس احسان کے لیے

ہمیشہ شکر گذار رہوں گا۔" (۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء)

"امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کے قائم مقام ہو سکتی ہے، ہر اسلامی ملک کا اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک واحد امام ہو، موخر الذکر صورت موجودہ فرق اسلامیہ کی موجودگی میں کیونکر بروئے کار آسکتی ہے؟ مہربانی کر کے ان سوالات پر روشنی ڈالیے"..... (۷ اپریل ۱۹۲۶ء)

"اجتہاد کی بنا محض عقل بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے یا یہ بھی وحی میں داخل ہے اس پر آپ کیا دلیل قائم کرتے ہیں...... وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں"؟

"حضور نے اذان کے متعلق صحابہ سے مشورہ کیا، کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت میں آئیگا یا امامت کے تحت میں؟..... امام ابوحنیفہ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچہ کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ کی اساس کیا ہے"؟ (۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء)

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے، بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے...... کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے، اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی"؟...... (۷ مارچ ۱۹۲۸ء)

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرما دیں، میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا۔" (۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء)

"مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ کا ایک ٹکڑا جو ترجمہ کیا ہے ......
اس میں شعار تعزیرات ...... ہے، مہربانی کر کے یہ فرمایئے کہ لفظ شعار سے کیا مراد ہے
اور اس کے تحت میں کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں، اس لفظ کی مفصل تشریح
مطلوب ہے، جواب کا سخت انتظار رہے گا۔" (۲۲ ستمبر ۱۹۲۹ء)

"حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زماں کی
بحث کس کس جگہ ہے؟ ...... حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی اس مضمون پر
بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمایئے، متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت
زماں یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث کونسی کتاب میں ملے گی۔" (۸ اگست ۱۹۳۳ء)

نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان ...... قلمی یا مطبوعہ ہے، نور الاسلام کا زمانہ
کون سا ہے (۴ ستمبر ۱۹۳۳ء) ملا محب اللہ بہاری کی کتاب جوہر الفرد کہاں ملے گی
(۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء)

"اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز
ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے، اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا
عکس ہونا چاہیے یا یوں کہیے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے، کیا
یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب شاید فتوحات میں
ہی ملے مہربانی کر کے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمایئے اور دیکھیے کہ کیا انھوں نے مکان
پر بھی کچھ بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے؟ اس
زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں اور جواب جہاں تک ہو جلد مانگتا ہوں" (۱۵ دسمبر ۳۳ء)

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے...... نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج
ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا

ہے۔ اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمایئے" (۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء)

" احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے؟ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح فرمایئے۔ زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟...... اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرع اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ اس مسئلہ کا سیاست اور اجتماع معاشرت سے گہرا تعلق ہے کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد ہوگی، صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں؟ صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے" (یکم فروری ۱۹۳۴ء)

" قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان میں کون سے نبی باہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزہ ہیں، لفظ نار کا روٹ عربی زبان میں کیا ہے لفظ نجات کا روٹ کیا ہے اور روٹ کے لحاظ سے اس کے معنی کیا ہیں"؟

(۶ ستمبر ۱۹۳۴ء)

ان استفسارات کے جوابات حضرت سید صاحبؒ برابر دیتے رہے، افسوس ہے کہ وہ محفوظ نہیں ہیں، شاید ڈاکٹر اقبال کے کاغذات میں ہوں، اگر وہ بھی شائع کر دیئے جاتے تو بہت سے مفید مذہبی، فقہی، تاریخی اور علمی معلومات حاصل ہو جاتے سید صاحبؒ نے اقبال نامہ کے مرتب کو ڈاکٹر صاحب کے خطوط بھیجتے وقت کچھ حواشی ضرور لکھ دیے تھے مگر وہ سب ہی مختصر اور ناکافی ہیں لیکن خود ڈاکٹر صاحب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ جو جوابات دیتے اُن سے ڈاکٹر صاحب کو پوری تشفی ہو جاتی، اسی لیے وہ اپنے خطوط میں لکھتے رہے:

" آپ کا نوازش نامہ قوتِ روح اور اطمینانِ قلب کا باعث ہے" (۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء)

"نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے بہت شکر گزار ہوں، جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لیے کافی ہے۔" (۲۲ اگست ۲۲ء)

"نوازش نامہ معلومات سے لبریز ہے، نہایت شکر گزار ہوں۔" (یکم فروری ۱۹۲۴ء)

"آپ اپنے نوازش نامہ کی طوالت کے عذر خواہی کرتے ہیں مگر میرے لیے یہ طویل خط باعثِ خیر و برکت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا ہے اور گزشتہ رات چودھری غلام رسول مہر سے بھی پڑھوا کر سنا اور احباب بھی اس مجلس میں شریک تھے، اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا" (۲۴ اپریل ۲۶ء)

ڈاکٹر اقبال کے اس آخری اقتباس میں ان کے عجز و انکسار کے ساتھ انکی شرافت اخلاق اور شرافت طبع بھی نمایاں ہے جو ان کی طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا اور جو خود افکار اسلامی کا ہمالیہ بنا ہوا تھا، اس نے یہ لکھنے میں بالکل تامل نہیں کیا کہ علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔ (۴ ستمبر ۱۹۳۳ء)

ڈاکٹر صاحب حضرت سید صاحب کو مفید مشورے بھی دیتے رہے، ایک بار سید صاحبؒ نے ان کو اپنی ایک غزل بھیجی تو انھوں نے لکھ بھیجا کہ آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص مجھے یہ شعر بہت پسند آیا۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں — وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

لیکن ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو یہ بھی مشورہ دیا کہ مولانا شبلی کی طرح تاریخی نظمیں لکھیں، سید صاحب کو شاعری سے صرف اسی حد تک لگاؤ رہا کہ جب ان پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی تو کوئی نظم یا کوئی غزل کہہ دیتے ورنہ ان کا زیادہ

وقت تصنیف و تالیف میں ہی صرف ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب نے سید صاحبؒ سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ یاجوج ماجوج پر کوئی مضمون لکھیں کیونکہ یہ امر تحقیق کا محتاج ہے (یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء) جہاں تک مجھ کو یاد ہے سید صاحبؒ اس پر کوئی مضمون قلمبند نہ کر سکے پھر اپنے ایک خط (مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء) میں ڈاکٹر صاحب سید صاحب کو لکھتے ہیں کہ اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اگر مولانا شبلی ہوتے تو میں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا، موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا، یہ کام سید صاحبؒ خود تو نہ کر سکے لیکن انھوں نے اپنے رفیق کار مولانا عبدالسلام ندوی سے علامہ خضری کی تاریخ فقہ اسلامی کا ترجمہ کرایا جس کے کئی ایڈیشن اب تک دارالمصنفین سے شائع ہو چکے ہیں پھر ایک اور خط میں لکھتے ہیں، دارالمصنفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب لکھنی چاہیے اس کی سخت ضرورت ہے، عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔ (۴ ستمبر ۱۹۳۳ء)

سید صاحبؒ نے مولانا عبدالسلام ندوی سے حکمائے اسلام دو جلدوں میں لکھوائی ہے جس میں ہندوستان کے حکماء کا بھی ذکر آگیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو زمان و مکان کے فلسفہ سے بڑی دلچسپی رہی، اس لیے وہ اپنے ایک خط میں سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں کہ میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے، یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں

(۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء) لیکن حضرت سید صاحبؒ کو اس کام کو انجام دینے کی فرصت ملی۔

علم و فن کے ان دو ستاروں کا قران السعدین بھی ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب تو کبھی اعظم گڑھ تشریف نہیں لائے لیکن حضرت سید صاحبؒ کو لاہور جانے کا بارہا اتفاق ہوا جہاں وہ ڈاکٹر صاحب سے ملتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کو جب سید صاحب کے لاہور آنے کی خبر ملتی تو ان کو اپنے ہی یہاں مہمان ٹھہرانا پسند کرتے (دیکھو اقبال نامہ مکتوب مورخہ ۵ جولائی ۱۹۲۲ء) لیکن دونوں کو ۱۹۳۳ء کے سفر افغانستان میں ایک ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا، اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے ڈاکٹر صاحب، راس مسعود اور سید صاحب کو افغانستان کی بعض علمی اور تعلیمی اصلاحات کے سلسلہ میں افغانستان مدعو کیا تھا، سید صاحب نے اس سفر کے دلچسپ کوائف ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء کے معارف کی کئی اشاعتوں میں قلمبند کیے ہیں، ان میں ڈاکٹر صاحب کی جن جن باتوں سے متاثر ہوئے ان کو بھی اپنے احاطۂ تحریر میں لائے ہیں۔

ایک موقع پر چینی ترکستان کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے ان ہی جہازوں کے ذریعہ سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی۔ اب آئندہ مشرق وسطیٰ کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا، تجارتی قافلے اب موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں آئے جائیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا، اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی پیشین گوئی بڑی حد تک صحیح تھی، آج مشرقِ وسطیٰ میں جو سیاست کھیلی جا رہی ہے اور یہاں

آئے دن جو انقلاب ہوتے نظر آرہے ہیں، ان کا مطالعہ کرکے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی فراست اور دُوربینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

افغانستان میں ہندوستانی مہمانوں کے اعزاز میں انجمن ادبی کابل نے ایک دعوت دی، تو اس میں تقریریں بھی ہوئیں، سیّد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کی تقریر فلسفیانہ انداز میں بہت ہی پُراثر تھی، اس پوری تقریر کو سیّد صاحبؒ نے معارف (مارچ ۱۹۳۴ء) میں نقل کیا ہے، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوّری یا موسیقی یا معماری جو بھی ہو، ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے اور اسی بنا پر آرٹ کو چاہیے کہ میں ایجاد کہوں نہ تفریح، شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کرسکتا ہے اس وقت جب حکومت کوشش کررہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ اخلاف نوجوانوں کے لیے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ شاعر جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے اس وقت وہ سخت خوفناک اور بربادکُن ہوجاتا ہے اور جو حُسن قوت سے خالی ہو وہ محض ایک پیغام موت ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است   دلبری با قاہری پیغمبری است

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے شاعری اور شاعر سے متعلق ایک عجیب نکتہ پیدا کیا، جو غور کرنے کے لائق ہے، انھوں نے فرمایا:

"ایک قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں بلکہ جو چیز حقیقت میں قوم کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے وہ تخیّل ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے

پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے، قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامردی سے نشو ونما پا کر مر جاتی ہیں، جو قوم ترقی کے راستہ پر چل رہی ہے اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے"

آخر میں انھوں نے تمام افغانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملی کی زندگی سے آشنا کر دے۔"

یہ ہندوستانی مہمان غزنی پہنچے تو حکیم سنائی کے مزار کی بھی زیارت کی، سید صاحبؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :

"حکیم و شاعر اقبال کو حکیم و شاعر سنائی کے مزار کے دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا۔۔۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مزار کے اندر بطریق مسنون دعا پڑھی حکیم سنائی کی جلالت شان سے کون واقف نہیں، ہم سب اس منظر سے متاثر تھے مگر ہم میں سے سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا، وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے۔"

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ

واپسی میں چمن سے کوئٹہ تک سید صاحبؒ اور ڈاکٹر صاحبؒ دونوں نے ایک موٹر میں سفر کیا، سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ راستہ میں ڈاکٹر صاحب نے روحانیات کے ذاتی مشاہدات اور تجربے اور سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی، مختلف شیوخ اور بزرگان سلاسل کا تذکرہ رہا، گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد کا بھی ذکر کیا تو اس سلسلہ میں سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں :

"اس ضمن میں معلوم ہُوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حسیاتِ خفتہ کے تاروں میں جس مضراب نے حرکت پیدا کی وہ خود ان کے والد ماجد کی ذات با برکات تھی۔ گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا جس نے میرے دل پر بے حد اثر کیا، فرمایا کہ اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا، ایک صبح کو نماز کے بعد حسب دستور میں تلاوت میں مصروف تھا کہ والد صاحب مرحوم ادھر آئے اور دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں، فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اُترا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا، تلاوت کا مزہ نہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، فرمایا جب بی اے پاس ہو جاؤ گے تو بتاؤں گا، کچھ دنوں کے بعد جب انھوں نے بی اے کر لیا تو اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس مقام کے حصول کی تدبیر پُوچھی، مرحوم نے ان کو کچھ طریقے اور دعائیں بتائیں اور نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے ملّتِ محمّدی کی خدمت بجالاتا رہے گا، ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی اور ایک عالَم ان کے نغمہ سے سرشار و مست تھا اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہا تھا۔ باپ اپنے بیٹے کی اس علیٰی نفسی سے مسرور ہو کر اس دُنیا سے سُدھارا۔"

حضرت سیّد صاحبؒ افغانستان کے سفر سے لوٹے تو ڈاکٹر اقبال کی عالی ظرفی اور اخلاق کی پاکیزگی کے علاوہ ان کی فکر و نظر کی بلندی سے اور بھی زیادہ متاثر تھے، اور دارالمصنّفین کی نجی مجلسوں میں بارہا کہا کہ اسلام میں صدیوں کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکّر

پیدا ہوا ہے، ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ کابل ہی کے سفر میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری ہندوستان میں باقی رہے گی، ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے سید صاحبؒ سے فرمایا کہ نہیں، جب تک دارالمصنّفین کا لٹریچر ہندوستان میں رہے گا اس وقت تک ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا۔ سر راس مسعود بھی اس موقع پر موجود تھے، انھوں نے کہا "بس یُوں کہیے جب تک ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور دارالمصنّفین کا لٹریچر باقی رہے گا ہندوستان میں اسلام باقی رہیگا۔"

۱۹۳۵ئہ میں ڈاکٹر اقبال کا مجموعۂ کلام بالِ جبریل شائع ہوا تو اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب نے سیّد صاحب کو بھی بھیجا، جب یہ نسخہ دارالمصنّفین پہنچا تو سیّد صاحبؒ نے بہت ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا، بار بار پڑھا، اپنے رفقائے کار کو پڑھ کر سُنایا، ان سے پڑھوا کر سُنا اور پھر جُون ۱۹۳۵ئہ کے معارف میں اس پر ایک لمبی تقریظ بھی لکھی، جس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز اردو شاعر کی حیثیت سے کیا، مگر کم از کم بیس برس سے وہ اپنے سامعین کی وسعت اور دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصّہ تک اس کو پہنچانے کی خاطر اپنے حکیمانہ اسلامی خیالات کو مناسب پیرایۂ بیان میں ادا کرنے کے لیے فارسی میں اظہارِ خیال کرنے لگے اور مولانا رومی کی رہنمائی میں آسمانوں کی سیر فرماتے رہے، اب بالِ جبریل کی مدد سے وہ پھر زمین پر اُتر رہے ہیں مگر اس زمین پر بھی وہ آسمانوں ہی کے لیے آمادۂ پرواز ہیں۔

پھر یہ بتا کر اس مجموعہ کے مختلف حصّوں میں کیا کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ہر نظم میں شاعر نے طرح طرح سے خداوند جل و علا کی شانِ غیوری کو حرکت میں لانے کی کوشش کی ہے کہیں وہ رُوٹھا ہے کہیں وہ رو رہا ہے، کبھی سجدہ میں گر پڑا ہے کبھی اُٹھ کر تن گیا ہے اور اپنی بندگی و عبودیت پر اترا رہا ہے اور پھر فوراً ہی اپنی حاضری و درماندگی کی ساری بساط

کو اس بارگاہ بے نیاز میں نذر لاتا ہے ..... یہ کبھی غزنی میں سنائی کے مزار پر کبھی قرطبہ کی مسجد میں کبھی فلسطین کے بیت المقدس میں اور کبھی یورپ کے تماشا گاہوں میں شاعر کو مسلمانوں کی ناخود شناسی پر رونا آتا ہے، کبھی وہ ان کو سمجھاتا ہے، کبھی شرماتا ہے، کبھی دھمکاتا ہے، کبھی رُلاتا ہے اور ہر طرح کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمان اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اسلام کا پیغام لے کر وہ پھر پہنائے ارض کے گوشہ گوشہ میں دوڑ جائیں۔

سیّد صاحبؒ شروع میں تو ڈاکٹر صاحب کی زبان کے کچھ ناقد ضرور تھے لیکن اس مجموعہ کا مطالعہ کر کے ڈاکٹر اقبال کی زبان سے متعلق ان کی رائے بدل گئی، اسی لیے بڑی فراخدلی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ بالِ جبریل کی نسبت سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں شاعر نے بانگ درا سے بڑھ کر اپنی شاعرانہ صفت، سلاست، روانی، بے تکلفی اور زبان کی صحت میں حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا ہے اور عجب نہیں کہ بالِ جبریل کو دیکھ کر لکھنؤ اور دہلی کے صنعت گر سخنور بھی پنجاب کے سخندان کا لوہا مان لیں، زبان میں غزل کی سی شیرینی تو نہیں مگر قصائد کی سی جزالت اور متانت پوری طرح موجود ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں سیّد صاحب اور ڈاکٹر صاحب دونوں کی صحت بہت خراب رہی سیّد صاحب دیرہ دون جا کر مقیم ہو گئے تھے اور ڈاکٹر صاحب بھوپال میں علاج کرا رہے تھے، پھر بھی اگست سنہ ۱۹۳۶ء میں وہ سیّد صاحبؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ وہ قوانین اسلام پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے سیّد صاحب سے مشورے بھی طلب کیے لیکن ڈاکٹر صاحب کی صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ کتاب مکمّل نہ ہو سکی، لیکن اسی سال ان کا مجموعہ کلام ضربِ کلیم شائع ہُوا۔ انھوں نے سیّد صاحب کو یہ بھیجا تو سیّد صاحب نے اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس پر تبصرہ کرتے ہُوئے لکھا:

" ہمارے حکیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ایک نیا ادبی معجزہ ضرب کلیم کے نام سے ظاہر ہوا ہے۔ اس میں موصوف کی وہ تازہ اُردو نظمیں ہیں جن میں اسلام کے نقطۂ نظر سے زمانہ موجودہ کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے لیکن معلوم نہیں کہ یہ حضرت کلیم کی وہ ضرب ہے جو بحرِ احمر پر پڑی تھی جس سے دریا پھٹ گیا تھا اور اس سے ایک قوم آزاد اور دوسری برباد ہوئی تھی، یا وہ ضرب ہے جو وادی تیہ کی ایک چٹان پر پڑی تھی جس سے پانی کی بارہ دھاریں بنی اسرائیل کے پیاسوں کے لیے پھوٹ نکلی تھیں بہرحال ان دو میں سے جو ہو وہ ہمارے لیے نیک فال ہی ہے۔"

آگے چل کر سید صاحبؒ لکھتے ہیں :

" حضرت اقبال کی شاعری اب شاعری کی حدود سے نکل کر خالص حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے۔ ان من الشعر لحکمۃ کے خلعت نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے، اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں بلکہ عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے، اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت و موعظت ہے وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سنانے کے لیے نہیں بلکہ ان قوموں کے عروج اور زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لیے ہے، اب وہ میدانِ جنگ کار جز یا مسافرانِ راہ کے لیے بانگِ درا نہیں بلکہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبرئیل امین کا پیام ہے "

اور جب اپریل ۱۹۳۸ء میں سید صاحب کو ڈاکٹر اقبال کی وفات کی خبر ملی تو وہ نہایت رنج و غم میں اُٹھ اُٹھ کر ٹہلتے تھے، ان کو یاد کرتے اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں جیسے ان کے کسی عزیز خاص کی المناک موت ہو گئی ہو، بھرائی ہوئی آواز سے انکی زندگی کے مختلف واقعات سناتے اور اپنے رفقائے کار سے کئی روز تک ان ہی کا ذکر

سننا پسند فرماتے، پھر اسی وفورِ غم میں ماتمِ اقبال کی سرخی قائم کر کے ڈاکٹر اقبال پر ایک تحریر لکھنے بیٹھ گئے اور جب یہ ختم ہوئی تو اس کے ہر جملہ سے ان کے رنج و الم اور سوز و گداز کا اندازہ ہوتا ہے، خود پیکرِ غم بن کر انھوں نے یہ تحریر لکھی ہے اور شاید ان کے قلم سے اس سے بہتر کوئی اور تحریر نہ نکلی، اس کا آغاز اس طرح کرتے ہیں :

" وقعت الواقعہ آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اسکے شعر کی ہر پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب شاعرِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوندا اس کے دل شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا غم خواری فرما اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر۔"

پھر سیرۃ النبی کے مصنف کی یہ رائے پڑھنے کے لائق ہے کہ مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لایا تھا، وہ توحیدِ خالص کا پرستار، دینِ کامل کا علم بردار، تجدیدِ ملت کا طلب گار تھا۔ اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسولِ انام علیہ السلام

کا عشق پیوست تھا، اور اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں، اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی۔

آجکل اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ کے ماخذوں پر طرح طرح کی خیال آرائیاں اور نکتہ آفرینیاں کی جا رہی ہیں لیکن سید صاحب نے چند فقروں میں ان کی شاعری کے جو رموز و نکات بتائے ہیں وہی دراصل حقیقت ہے۔ سید صاحب رقمطراز ہیں :

" اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموزِ فطرت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔"

پھر آخر میں لکھتے ہیں :

" اقبال! ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال! فضل و کمال کا پیکر اقبال! حکمت و معرفت کا دانا اقبال! کاروانِ ملت کا رہنما اقبال رخصت رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ وعلیک ورحمتہ الی یوم التلاق۔

(منقول از معارف ۱۰۰ : ۱ (جولائی ۱۹۶۷ء) ص ۵۰-۳۸)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اقبالؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مسئلہ قومیت پر اختلاف رائے کی نوعیت اور ازالہ غلط فہمی

[جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا یہ مضمون پہلے ماہنامہ "میثاق" لاہور کی فروری [illegible]ء کی اشاعت میں طبع ہوا تھا۔ پھر ماہنامہ "انوار مدینہ" نے اسے شائع کیا۔ ذیل میں یہ مقالہ ملخصاً پیش ہے۔]

اس تحریر سے دو مقاصد میرے پیش نظر ہیں۔ پہلا مقصد تو یہ ہے کہ گزشتہ زندگی (۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۴ء) میں مجھ سے جس قدر گستاخیاں حضرت اقدس مجاہدِ اعظم شیخ الاسلام آیۃٌ من آیات اللہ الصمد سیدی و شیخی و سندی الحاج الحافظ المولوی السید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کی شان رفیع البنان میں سرزد ہوئی ہیں، اُن پر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے غیر مشروط انداز میں اظہارِ ندامت اور اعترافِ تقصیر اور اقرارِ جرم کروں اور بارگاہِ ایزدی میں صدقِ دل سے استغفار کروں۔

دُوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک اہم تاریخی واقعہ کی وضاحت کر دوں اور حقائق کو ان کی اصل شکل میں پیش کر دوں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال

مرحوم نے محض اخباری اطلاع کی بنا پر تین اشعار سپرد قلم کیے تھے جن کی وجہ سے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ جناب طالوت نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول و منعطف کرائی کہ حضرت اقدسؒ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وطن کو اساس ملت بنالو، اس لیے دیانت و عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ اب مجھے حضرت مولانا حسین احمد صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ اعلان روزنامہ "احسان" لاہور میں ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہو گیا تھا لیکن قوم کی بدقسمتی سے ۲۱ اپریل کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا جب کہ ان کا آخری مجموعۂ کلام موسوم بہ "ارمغان حجاز" نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اگر یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان تین اشعار کو حذف کر دیتے یا حاشیے میں اس حقیقتِ حال کو واضح کر دیتے کہ میں نے یہ اشعار غلط اخباری اطلاع کی بنا پر لکھے تھے۔ بعد ازاں حضرت مولانا نے اخباری رپورٹ کی تردید کر دی اس لیے ان اشعار کو کالعدم یا مسترد سمجھنا چاہیے لیکن افسوس کہ یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس لیے نہ ان اشعار کو حذف کیا گیا اور نہ حاشیے میں حقیقتِ حال کو واضح کیا گیا۔

نتیجہ اس غفلت اور کوتاہی کا یہ نکلا کہ گزشتہ تیس سال سے مسلمانانِ عالم بالعموم، اور مسلمانانِ پاکستان بالخصوص ان اشعار کی بنا پر حضرتِ اقدسؒ سے بدگمان ہوتے چلے آ رہے ہیں اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی اصلاحِ خیال کا فریضہ بھی انجام دے دوں تاکہ وہ سوءِ ظن کے گناہ سے محفوظ ہو جائیں۔ میں ان اشعار کو تو خارج نہیں کر سکتا، مگر مسلمانوں کو یہ تو بتا سکتا ہوں کہ حضرت اقدسؒ نے اپنی تقریر میں نہ تو یہ فرمایا تھا کہ ملت کی بنیاد وطن ہے اور نہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تم وطن کو اپنی ملت کی بنیاد بنالو۔ یہ اشعار بلا تحقیقِ حال سپردِ قلم ہو گئے تھے چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب پر

حقیقت منکشف ہوئی تو انھوں نے اپنے الفاظ واپس لے لیے تھے بالفاظ دیگر ان اشعار کو قلمزد کر دیا تھا۔ دُعا ہے اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمائے اور میری اس تحریر کو عامۃ المسلمین کے لیے نافع بنائے۔ آمین

[چشتی صاحب نے اپنے مقالے کا باب اول بعنوان "مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اپنے سابقہ گستاخانہ اور توہین آمیز رویّے پر اعتراف تقصیر و اظہار ندامت" سپردِ قلم کیا ہے جس کے آخر میں ان الفاظ میں توبہ کی ہے :]

اے اللہ! میں صدقِ دل سے توبہ کرتا ہوں، میری لغزشوں، خطاؤں اور گستاخیوں کو معاف کر دے جو میں نے اپنے شیخ طریقت، مخدومِ ملت، محرم رازِ نبوت، واقفِ اسرارِ رسالت اور آشنائے مقامِ محمدی (علیہ افضل التحیۃ والثناء) کی شان میں روا رکھی تھیں۔

اے اللہ اپنے مقبولِ بارگاہ بندوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ میرے حق میں معافی کے لیے دُعا کریں۔ مجھے یقین ہے کہ تُو ان کے وسیلے سے مجھ پر کرم کرے گا اور مجھے میرے شیخ، بلکہ شیخ العرب حضرت مدنیؒ کی نسبتِ عالیہ سے حصہ وافر عطا فرمائے گا اور مجھے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

رب تقبل منی انک انت السمیع العلیم، وتب علی انک انت التواب الرحیم وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہٖ وعبدہٖ ورسولہ الکریم

[باب دوم میں "مسئلۂ قومیت پر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ اقبال مرحوم کے اختلافِ رائے کی حقیقی نوعیت، اشعارِ اقبال اور حقیقتِ حال" کو واضح کیا گیا ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب رقمطراز ہیں :]

تمہید : چونکہ موجودہ زمانے کے اکثر مدّاحانِ اقبال نہ تو "ارمغانِ حجاز" میں مندرج

اشعار بعنوان حسین احمدؒ کے پس منظر سے آگاہ ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ جب علامہ اقبال پر حقیقت حال منکشف ہوگئی تو انھوں نے اس امر کا اعتراف کر لیا تھا کہ "اب مجھے مولانا حسین احمد مدنی پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔"

اس لیے موجودہ اور آئندہ نسل کی آگاہی کے لیے میں اس داستان کو مفصل طور پر سپردِ قلم کر رہا ہوں تاکہ عوام اور خواص دونوں حضرت اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں گستاخی کے جرم سے محفوظ رہیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور و معروف عالم دین، شیخ الہندؒ کے جانشین، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، لاکھوں مسلمانوں کے روحانی پیشوا اور لاکھوں سرفروشوں کے سیاسی رہنما جس کے قدموں کو ۱۹۲۱ء میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جنت آشیانی نے بھری عدالت میں بوسہ دیا تھا جس نے ساری عمر ملاعنہ فرنگ کے خلاف جہاد کیا، جس نے ساری عمر کلمۂ حق کہا، جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں جس کی عظمت پر آج بھی مالٹا گواہی دے رہا ہے کراچی، بمبئی، نینی تال، بریلی، فیض آباد، مراد آباد اور خدا معلوم کتنے شہروں کی جیلیں آج بھی اس آہِ سحر گاہی اور قرآن الفجر کی برکات سے مالا مال ہیں جس نے ایک دو نہیں پورے چودہ سال تک حرمِ نبوی میں حدیث نبوی کا درس دیا۔

گردن نہ جھکی جس کی کسی شاہ کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے مُردوں میں پڑی جان

جس کی علو ہمت کا یہ عالم تھا کہ اس نے ملاعنہ فرنگ کے خطابات درکنار خود حکومت ہند کے خطاب (پدم بھوشن) اور طلائی تمغے دونوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں نے اپنے وطن کو کسی خطاب یا جاگیر حاصل کرنے کی نیت سے آزاد نہیں کرایا بلکہ اپنا فرض ادا کیا، انگریز میرا دشمن تھا۔ میرے وطن کا دشمن تھا اور سب سے بڑھ کر میرے دین کا دشمن تھا اس لیے

اُسے ختم کرنا میرا دینی فریضہ تھا۔

حضرتِ اقدس کے عشاق اور تلامذہ محض اظہارِ حقیقت کے طور پر آں جنابؒ کو مدنی کے لقب سے یاد کرتے تھے اور آج بھی یاد کرتے ہیں اور بجا طور پر، کیونکہ حضرت اقدسؒ کی زندگی کا بڑا حصہ مدینۃ النبیؐ میں بسر ہُوا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یہ تو حضرتِ اقدس کی روحانی عظمت کی دلیل ہے کہ آپ خود ساری عمر اپنے آپ کو "ننگِ اسلاف" لکھتے رہے اور دُنیا آپ کو "مدنی" کہتی رہی اور انشاء اللہ کہتی رہے گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ شیخؒ[1]

قارئین کرام سے اس اعراض عن الموضوع کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ سطور بے اختیار نوکِ قلم پر آ گئیں۔ بعض اوقات ایسے مواقع پیش آجاتے ہیں کہ دل بے اختیار باقی نہیں رہتا اب میں اس واقعہ کی تفصیل سپردِ قلم کرتا ہوں۔ یعنی ؎

دگر از سر بگیرم قصۂ زلفِ پریشاں را

۸ر جنوری ۱۹۳۸ء کی شب میں حضرتِ اقدس مولانا مدنیؒ نے صدر بازار دہلی متصل پل بنگش ایک جلسے میں ایک تقریر فرمائی جس کا بڑا حصہ ۹ر جنوری کے "تیج" اور "انصاری" دہلی میں شائع ہوا چند روز کے بعد "الامان" اور "وحدت" دہلی نے اس تقریر کو قطع و برید کے بعد اپنے صفحات میں جگہ دی۔ ان پرچوں سے "زمیندار" اور "انقلاب" لاہور نے اس تقریر کو نقل کیا اور یہ جملے حضرت اقدسؒ کی طرف منسوب کر دیئے کہ حسین احمد دیوبندی نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ

---

[1] اشارہ بجانب شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز

چونکہ اس زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بھی اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔ او کما قال

جب یہ اخباری اطلاع علامہ اقبال کے کان میں پڑی تو انھوں نے حضرت اقدسؒ سے استفسار یا تحقیق کیے بغیر یہ تین اشعار سپردِ قلم کر دیئے۔

عجم ہنوز نداند .... الخ

ان اشعار کی بنا پر ہندوستان کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جس کی تفصیل اس زمانے کے روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

خوش قسمتی سے ایک دردمند مسلمان نے جنھوں نے مصلحتہً "طالوت" کا نام اختیار کر لیا تھا، حقیقتِ حال دریافت کرنے کے لیے حضرت مدنیؒ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس کے جواب میں حضرت موصوفؒ نے ایک خط انھیں لکھا۔ پھر طالوت صاحب نے حضرت مدنیؒ کے اس خط کے اقتباس ایک مکتوب میں علامہ اقبال کی خدمت میں لکھ بھیجے۔ مکمل مکتوب ملاحظہ ہو:

طالوت صاحب کا خط علامہ اقبال کے نام

مطاع و محترم اسلامیاں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اگرچہ میرا یہ درجہ نہیں کہ آپ سے شرفِ مخاطبت حاصل کر سکوں مگر الضرورات تبیح المحذورات کی بنا پر باوجود اس علم کے کہ آپ کی طبیعت ناساز رہتی ہے، تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں، امید ہے کہ آپ اخلاقِ کریمہ کی بنا پر اپنے اوقاتِ ثمینہ میں سے دو چار منٹ نکال کر میرے عریضے کو پڑھنے اور اس کے جواب کی زحمت برداشت کریں گے۔

مولانا حسین احمد صاحب قبلہ کے متعلق آپ کی نظم "عجم ہنوز نداند الخ" احسان میں چھپی

اور اس سے پہلے "احسان" "زمیندار" "انقلاب" میں ان کے خلاف متواتر پروپیگنڈا بھی کیا جاتا رہا، میں نے مولانا کو ایک نیاز نامہ میں اس نظم اور اس پروپیگنڈا کی طرف توجہ دلائی، اس کے جواب میں انھوں نے از راہِ شفقت ایک مفصل تحریر بھیجی، جس کے اہم اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

"میں نے بعض ضروری مضامین کے بعد ملک کی حالت، بیرونی ممالک اور غیر اقوام نیز اندرونِ ملک میں آزادی کی ضرورت کا تمہیدی مضمون شروع کیا تو کہا کہ "موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں، دیکھو انگلستان کے بسنے والے، سب ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں، نصرانی بھی، پروٹسٹنٹ بھی ہیں، کیتھولک بھی، یہی حال امریکہ، فرانس، جاپان وغیرہ کا ہے" الخ جو کہ جلسہ درہم برہم کرنے کیلئے آئے تھے اور موقع چاہ رہے تھے، انھوں نے شور مچانا شروع کیا، میں اس وقت یہ نہیں سمجھ سکا کہ وجہ شور کی کیا ہے، جلسہ جاری رکھنے والے لوگ اور وہ چند آدمی جو کہ شور و غوغا چاہتے تھے، سوال و جواب دیتے رہے اور چُپ رہو وغیرہ کے الفاظ سنائی دیئے، اگلے روز "الامان" وغیرہ میں چھپا، کہ حسین احمد نے تقریر میں کہا ہے کہ قومیت وطن سے ہوتی ہے، مذہب سے نہیں ہوتی اور اس پر شور و غوغا ہُوا۔ اس کے بعد اس میں اور دیگر اخباروں میں سب و شتم چھاپا گیا، کلام کے ابتدا اور انتہا کو حذف کر دیا گیا تھا، اور کوشش کی گئی تھی کہ عام مسلمانوں کو ورغلایا جائے، میں اس تحریف اور اتہام کو دیکھ کر چُپکا ہو گیا، تقریر کا بڑا حصہ "انصاری اور تیج" میں چھپا، مگر اس کو کسی نے نہیں لیا۔ "الامان" اور "وحدت" سے "انقلاب"، "زمیندار" نے لے لیا اور اپنے دلوں کی بھڑاس نکالی، ۸، یا ۹، جنوری کے "انصاری" اور

"نتیجہ" کو ملاحظہ فرمائیے، میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ مذہب وملت کا دار و مدار وطنیت پر ہے، یہ بالکل ہی افترا اور دجل ہے۔" احسان" مورخہ ۳۱ جنوری کے صفحہ ۳ پر بھی میرا قول یہ نہیں بتایا گیا، بلکہ یہ کہا گیا کہ" قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے"۔ اگرچہ یہ بھی غلط ہے مگر یہ ضرور تسلیم کیا گیا ہے کہ مذہب وملت کا مدار وطنیت پر ہونا، میں نے نہیں کہا تھا، شملہ کی چوٹیوں اور نئی دہلی سے تعلق رکھنے والے ایسا افترا اور اتہام کرتے ہی رہتے ہیں اس قسم کی تحریفیں اور سب وشتم ان کے فرائض منصبیہ میں سے ہیں ہی، مگر سر اقبال جیسے مہذب اور متین شخص کا، اُن کی صف میں آجانا ضرور تعجب خیز اُمر ہے، ان سے میری خط وکتابت نہیں، مجھ جیسے ادنیٰ ترین ہندوستانی کا اُن کی عالی بارگاہ تک پہنچنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اگر غیر مناسب نہ ہو تو ان کی عالی بارگاہ میں یہ شعر ضرور پہنچا دیجئے۔

هنيئاً مريئاً غير داء مخامر

لعزة من اعراضنا ما استحلت

افسوس کہ سمجھ دار اشخاص اور آپ جیسے عالی خیال تو یہ جانتے ہیں کہ مخالفت کی بنا پر اخبار ہر قسم کی ناجائز اور نازیبا کارروائیاں کرتے رہتے ہیں، ان پر ہرگز اعتماد ایسے امور میں نہ کرنا چاہیے اور سر اقبال موصوف جیسے عالی خیال اور حوصلہ مند، مذہب میں ڈوبے ہوئے تجربہ کار شخص کو یہ خیال نہ آیا، نہ تحقیق کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔ آیت ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا الآیۃ گویا ان کی نظر سے نہیں گزری۔

اگر میری تقریر کے سیاق وسباق کو حذف بھی کر دیا جائے اور

عبارت میں تحریف کر کے حسبِ اعلان جریدہ "احسان" قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے" بنائی جائے، تب بھی میں نے کب کہا کہ ملت یا دین کی اساس وطن پر ہے۔ اس کے علاوہ تقریر میں تو اسلامی تعلیم اور نظریئے کا ذکر بھی نہیں تھا۔"

یہ مولانا کی تقریر کے وہ اقتباس ہیں، جو میرے نزدیک ضروری تھے کہ آپ کی نظر سے گزر جائیں، جہاں تک میرا خیال ہے، مولانا کی پوزیشن صاف ہے اور آپ کی نظم کا اساس غلط پروپیگنڈے پر ہے۔ آپ کے نزدیک بھی اگر مولانا بے قصور ہوں تو مہربانی فرما کر اپنی عالی ظرفی کی بنا پر اخبارات میں ان کی پوزیشن صاف فرمایئے، بصورتِ دیگر مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمایئے تاکہ مولانا سے مزید تشفی کر لی جائے، ہمارے جیسے نیاز مند جو دونوں حضرات کے عقیدت کیش ہیں، دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا ہیں۔ امید کہ باوجود عدیم الفرصتی کے ہمیں اس ورطۂ حیرانی سے نکالنے میں آیۂ رحمت ثابت ہوں گے۔

طالوت

علّامہ اقبال کا خط جناب طالوت کے نام

۱۶، فروری ۱۹۳۸ء

جنابِ من !

مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے۔ ان میں سے بعض میں تو اصل معاملہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، مگر بعض نے معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور مولوی صاحب کو بھی اس ضمن میں خطوط لکھے ہیں۔ چنانچہ آپ کے خط میں مولوی صاحب کے خط کے اقتباسات درج ہیں، اس واسطے میں نے آپ ہی کے خط کو جواب کے لیے انتخاب کیا ہے، جواب انشاء اللہ، اخبار "احسان" میں شائع ہوگا، میں فرداً فرداً علالت کی وجہ سے خط لکھنے سے قاصر ہوں، فقط

مخلص

محمد اقبال

علّامہ اقبال کا دوسرا خط جناب طالوت کے نام

۱۸ فروری ۱۹۳۸ء

جنابِ من سلام مسنون ! میں حسب وعدہ آپ کے خط کا جواب "احسان" میں لکھوانے کو تھا کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی جس کا گوش گزار کرنا ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ مولوی صاحب کو خط لکھ کر اس بات کو صاف کر دیں گے جو اقتباسات آپ نے اُن کے خط سے درج کیے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ: "آجکل قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اگر ان کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امرِ واقعہ کو بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے، البتہ اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کر لیں تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے، کیونکہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی ؟ اس خیال سے کہ بحث تلخ اور طویل نہ ہونے پائے اِس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ مولانا کا مقصود ان الفاظ سے کیا تھا ؟ مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلائیے کہ مَیں ان کے احترام میں کسی مسلمان سے پیچھے نہیں ہُوں . . .

مخلص ۔ محمّد اقبال

علّامہ اقبال کا تردیدی بیان

جو روزنامہ احسان لاہور مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہُوا

"مَیں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا"۔ (حضرت مدنیؒ کا بیان)

"مجھے اس اعتراف کے بعد ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔"

(علامہ اقبال کا مکتوب)

قومیّت و وطنیّت کے مسئلہ پر ایک علمی بحث کا خوشگوار خاتمہ

جناب ایڈیٹر صاحب "احسان" لاہور السلام علیکم

میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد صاحب کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے اس میں میں نے اس امر کی تصریح کر دی تھی کہ اگر مولانا کا یہ ارشاد " زمانہ حال میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں" محض برسبیلِ تذکرہ ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور اگر مولانا نے مسلمانانِ ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریۂ قومیت کا اختیار کر لیں تو دینی پہلو سے مجھے اس پر اعتراض ہے۔ مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار "انصاری" میں شائع ہُوا ہے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں :

" لہٰذا ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے، اور ان کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتہ اتحاد بجز قومیت اور کوئی رشتہ نہیں جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے"

اِن الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار "احسان" میں شائع ہُوا ہے لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا جس کی ایک نقل انھوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے۔ اِس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں :

"میرے محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیانِ واقعہ مقصود تھا تو اس

میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اور اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلافِ دیانت ہے
اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ
تقریر کے لاحق و سابق پر نظر ڈالی جائے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے
میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت
اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے۔ یہ
خبر ہے، انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورے کو ذکر بھی نہیں کیا۔ پھر اس
کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے۔"

خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار
کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس
بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اعتراض
کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے ان عقیدتمندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں، جنھوں نے
ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں۔ خدائے
تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید فرمائے نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیّتِ
دینی کے احترام میں، میں ان کے کسی عقیدتمند سے پیچھے نہیں ہوں۔" (محمد اقبال)

حرفِ آخر

الحمدللہ کہ میں نے اس زمانے کے عقیدتمندانِ اقبال کی آگاہی کے لیے اس صداقت کو دوبارہ واضح کر دیا کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد علامہ اقبال نے اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا اور وہ اشعار محض اس لیے "ارمغانِ حجاز" میں راہ پا گئے کہ اس اعتراف کے صرف تین ہفتوں کے بعد علامہ وفات پا گئے اور انھیں یہ ہدایت دینے کا موقع نہ مل سکا کہ ان اشعار کو ارمغانِ حجاز میں شامل نہ کیا جائے۔ اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ "ارمغانِ حجاز" میں اس نظم کے ساتھ یہ صراحت کر دی جائے کہ حقیقت حال سے آگاہ ہونے کے بعد علامہ مرحوم نے ان اشعار کو کالعدم قرار دے دیا تھا تو بہت اچھا ہو، کیونکہ اس تصریح کی بدولت قارئین حضرت اقدسؒ کے خلاف سوءِ ظن سے محفوظ ہو جائیں گے۔

تبصرۂ مرتب:

اقبال اور مولانا حسین احمد مدنیؒ قضیہ جناب طالوتؒ کی کوششوں سے

پورا نام عبدالرشید نسیم، طالوت، قلمی نام

یکم فروری ۱۹۰۹ کو ڈیرہ غازی خاں کے نواحی گاؤں چوٹی زیریں جمال خان میں پیدا ہوئے ان کے والد مولانا محمد بخش عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ بہت بڑے صوفی اور ولی اللہ تھے اور خواجہ غلام فرید سے تعلق باطنی رکھتے تھے۔ جناب طالوت نے ابتدائی تعلیم ڈیرہ غازیخان میں حاصل کی اور تکمیل دارالعلوم دیوبند سے۔ زمیندار، معارف، خیام، عالمگیر، العزیز اور دیگر رسائل میں علمی تحقیقی مضامین لکھتے رہے۔ انھوں نے دیوان فرید پر ۵۰ صفحات کا ایک مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ تحریر کیا اور متعدد ابتدائی کافیوں کا ترجمہ بھی کیا لیکن ترجمہ مکمل نہ کر سکے۔ پشاور یونیورسٹی کی دعوت پر ایم۔ اے عربی کے نصاب کے لیے ایک کتاب لکھی لیکن پیغام موت آ گیا اور یہ کتاب وہاں بھیجی نہ جا سکی۔ "تاریخ ادبِ عربی" بھی ان کی غیر مطبوعہ تصانیف میں شامل ہے۔ وفات سے قبل وہ گورنمنٹ نارمل سکول ملتان میں السنۂ شرقیہ کے استاد تھے۔ ۲۰ مارچ ۶۳ء کو انھوں نے وفات پائی۔ (مرتب)

اختتام پذیر ہوا۔ دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھا اور بالآخر حضرت علامہ نے فرمایا :

" میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا ...

... مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں" (انوارِ اقبال ص ۱۷۰)

لیکن نجانے ارمغانِ حجاز کے مرتبین نے پھر بھی کن مصلحتوں کے تحت وہ اشعار کتاب میں شامل کیے۔ حضرتِ علامہ کے بعض دوستوں اور ماہرینِ اقبالیات کی یہ رائے ہے کہ اگر یہ مجموعہ حضرتِ علامہ کی زندگی میں چھپتا تو یہ اشعار اس میں شامل نہ ہوتے۔ جناب خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں :

" ارمغانِ حجاز اگر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی زندگی میں چھپتی تو یہ نظم اس میں شامل نہ ہوتی" (اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۹ء ص ۶۰)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید " سرگزشتِ اقبال " میں تحریر کرتے ہیں :

" اگر وہ ارمغانِ حجاز کی ترتیب اپنی زندگی میں کرتے تو شاید وہ تین اشعار درج نہ کرتے جن میں مولانا حسین احمد مدنی پر چوٹ کی گئی تھی"۔

(سرگزشتِ اقبال ص ۴۷۵)

جس طرح حضرت علامہ مولانا مدنی کی حمیتِ دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدتمند سے پیچھے نہ تھے، اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی بھی ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔ وہ تحریر کرتے ہیں :

" یہ امر یقینی اور ناقابلِ انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے۔ وہ آسمانِ حکمت و

فلسفہ، شعر و سخن، تحریر و تقریر، دل و دماغ اور دیگر کمالاتِ علمیہ و عملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۹)

اِسی کتاب کے آخر میں علّامہ مرحوم کے لیے دُعا فرمائی ہے:

" آخر میں ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنی مغفرت اور فضل سے نوازے۔" (صفحہ ۷۹)

(مرتب)

قاضی افضل حق قرشی

اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ

یہ دونوں بزرگ ایک ہی زمانے میں، ایک ہی ملک میں اور ایک ہی ماحول میں باندازِ بے التفاتی یا بزنگِ تغافل ایک دوسرے کو دُور سے دیکھتے رہے ..... اور ایک دوسرے کے بارے میں، دوسروں کی زبانی باتیں سُنتے رہے ..... میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی تھے یا نہیں۔ اس میں مجھے شُبہ ہے۔ اس اندازِ تغافل کو کس چیز پر محمول کیا جائے ؟ رنگِ ناآشنائی ! معاصرانہ چشمک ؟ یا اختلافِ مزاج و مشرب و مسلک ؟

بزرگوں کے معاملات ہیں، ناموروں کی باتیں ہیں، بڑوں کے مسائل ہیں، ایک خورد، ایک ذرّہ حقیر، خاک پا، ان جھگڑوں کی وجہ بیان کرے تو قصہ دار و رسن نہ سہی، سنگِ خلائق کا نشانہ بننا تو لازمی ہے۔ کیا کہا جائے اور کیا کیا جائے !

علامہ اقبال نے مسائل و مشکلات کے بارے میں صدہا اہلِ علم و فضل سے مشورہ کیا ...
... اس فہرست میں اصاغر بھی ہیں اور اکابر بھی، علمائے دین بھی ہیں اور فضلائے جدید بھی ...
مگر فہرست سے جو نام غائب ہے وہ ابوالکلام کا ہے ..... مجھے معلوم نہیں کبھی دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوں (ممکن ہے ملے ہوں) خط و کتابت بھی شاید ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔
امام الہند نے تذکرہ سے لے کر غبارِ خاطر تک اپنی نثر کو فارسی اُردو کے متعدد شعراء

کے شعروں سے مزین کیا ہے لیکن اگر نہیں کیا تو علامہ اقبال کے شعروں سے نہیں کیا۔ داغ تک کے اشعار ہیں مگر اقبال کے نہیں !

یہ رنگ نا آشنائی ہے تو عجیب رنگ ہے، معاصرانہ چشمک ہے تو عجیب چشمک ہے یہ اختلافِ مزاج ہے تو عجیب اختلافِ مزاج ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے وجود ہی کا انکار کر دے[۱]

یہ ہیں الفاظ اُردو کے نامور ادیب اور نقاد جناب ڈاکٹر سید عبداللہ کے۔ مجھے سید صاحب کے ان محسوسات سے بصد عجز و نیاز اختلاف ہے۔

اقبال (۱۸۷۳ء ... ۱۹۳۸ء) اور ابوالکلام (۱۸۸۸ء ... ۱۹۵۸ء) اِس صدی کے دو عبقری تھے جنھوں نے برِ عظیم پاک و ہند کی علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مطابق :

" ابوالکلام اور اقبال اس دَور کے دماغ تھے"۔[۲]

ان دونوں کا پیغام ایک ہی تھا۔ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین :

" اور وہ یہ ہے کہ دین کی کنجی سے دُنیا کا دروازہ کھولو اور اسلام کے اسمِ اعظم سے آفاق کی تسخیر کرو"۔[۳]

اور دونوں کے مابین تعلقات دوستانہ تھے ۔

---

[۱] ڈاکٹر سید عبداللہ۔ مسائلِ اقبال (لاہور۔ اردو اکیڈمی، ۱۹۷۴ء) ص ۲۲۱

[۲] حضرت علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد ادیبوں اور نقادوں کی نظر میں "چٹان" ۲۰ : ۱۷ (۲۴ اپریل ۶۷ء) ص ۱۹

[۳] عبداللہ بٹ۔ "پیش لفظ" اپنی کتاب مقالات ابوالکلام میں (لاہور : قومی کتب خانہ ۱۹۴۳ء) ص ۹

[۴] ماہنامہ "لسان الصدق" کلکتہ سے ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو جاری ہوا اور ڈیڑھ برس جاری رہا۔

[۵] عبدالرزاق ملیح آبادی۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی (لاہور، مکتبہ چٹان ۱۹۶۰ء) ص ۳۲۳

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ان کے تعلقات کی ابتدا کب ہوئی۔ البتہ دونوں کی پہلی ملاقات اپریل ۱۹۰۵ء میں لاہور میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں ہوئی۔ مولانا آزاد اس اجلاس میں بحیثیت ایڈیٹر "لسان الصدق" مدعو تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا کی زبانی لکھتے ہیں :

"اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو مخزن نے نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا لیکن بہت جلد ہی لوگوں میں غیر معمولی شہرت ہو گئی تھی۔ انجمن میں ان کی نظم خوانی خاص طور پر شوق و ذوق سے سنی جاتی تھی۔ ان سے بھی پہلی مرتبہ اس سفر میں ملاقات ہوئی۔" [ہ]

مولانا آزاد نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ہفت روزہ "الہلال" جاری کیا۔ اس ہفت روزہ نے ملک بھر کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے مطابق :

"الہلال نکلتے ہی ابوالکلام مسلّم طور پر مولانا ہو گئے اور شہرت کے پروں سے اُڑنے لگے۔ الہلال کی مانگ گھر گھر ہونے لگی۔" [ہ]

اصل میں "الہلال" ایک تحریک تھی۔ اسلامیانِ ہند کی بیداری کی تحریک۔ اس نے تھوڑی ہی مدت میں علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ عوام تو عوام، خواص بھی چونک اُٹھے اور انھیں یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ ہم سب اپنے اصلی کام بھولے ہوئے تھے۔ "الہلال" نے ہمیں یاد دلایا۔ ملک کے مختلف گوشوں سے اس کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات اُٹھے۔ اقبال نے بھی "تحریکِ الہلال" سے دلچسپی اور ہمدردی کا عملاً اظہار کیا۔ چنانچہ انھوں نے "الہلال" کے لیے دس خریدار مہیا کیے۔ ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں "الہلال کی توسیعِ اشاعت" کے عنوان سے مولانا آزاد لکھتے ہیں :

[ہ] عبدالماجد دریابادی "چند یادیں" الجمعیۃ، ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء ص ۸۳

"الہلال کی توسیعِ اشاعت کے لیے ابتدا سے بغیر کسی تحریک اور طلب کے جو احباب سعی فرما رہے ہیں، دفتر ان کا شکر گزار ہے۔ ایسے حضرات تو بکثرت ہیں، جنھوں نے ایک ایک یا دو دو خریدار بہم پہنچائے مگر جن احباب نے خاص طور پر اس بارے میں سعی کی ہے اُن کے اسمائے گرامی شکریے کے ساتھ درج ذیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو مخلص اور بغیر منّت و طلب احسان کرنے والے احباب عطا فرمائے۔"[1]

اس فہرست میں سب سے زیادہ یعنی بارہ خریدار دہلی کے ایک[2] صاحب نے مہیا کیے مگر اپنا نام ظاہر نہ کیا اور دس دس خریدار اقبال اور مولانا سید عبدالحق بغدادی، نائب پروفیسر عربی محمڈن کالج علیگڑھ نے مہیا کیے۔

اقبال کی نظم "جوابِ شکوہ" ۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو جلسۂ امدادِ مجروحین بلقان منعقدہ باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں پڑھی گئی۔ الہلال کی ۲۶ فروری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں ریاست رام پور کے ہوم سیکرٹری صاحبزادہ مصطفیٰ خان شرر کی ایک طویل نظم[3] "جوابِ شکوہ کا اقبال" کے عنوان سے اس کی تائید میں چھپی۔ یہ الہلال کے دو صفحات پر محیط تھی۔ اس کا آخری بند یہ ہے:

آج اگر حالِ زبُوں ہے تو الم بے جا ہے — قلبِ اقبال ہرا ہے تو اچنبھا کیا ہے
دیکھیے باغ اُجڑتا ہے کبھی پھلتا ہے — تنگ دل ہیں تو کریں صبر یہی اچھا ہے
جب بہار آتی ہے کلیوں کی چٹک کہتی ہے — کب ہمیشہ خلش تنگ دلی رہتی ہے

---

[1] الہلال ۱ : ۱۳، ص ۱

[2] مولانا غلام رسول مہر کے مطابق یہ صاحب حکیم اجمل خان تھے۔ (مکتوب بنام فیض لدھیانوی مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء

[3] الہلال ۲ : ۸ ص ۱۳۲ - ۱۳۳

۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو "الہلال" سے پریس ایکٹ کے تحت ۔ ۲ ہزار روپے کی ضمانت طلب ہوئی جو ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو ضبط کر لی گئی اور "الہلال" کے نمبر بابت ۱۴ اکتوبر و ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء بھی ضبط ہوئے ... مولانا ان دنوں کلکتہ سے باہر تھے۔ جب انھیں دفتر کی طرف سے واقعہ کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے بذریعہ تار ہدایت کی کہ :

"جو نمبر چھپ رہا ہے اس کو فوراً شائع کر دو اور ایک مختصر نوٹ میں ضبطی کی اطّلاع کے ساتھ یہ اعلان کر دو کہ ہم اپنی ذات سے آخر وقت تک الہلال کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور انشاء اللہ العزیز رکھیں گے"۔

چنانچہ "الہلال" کا ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کا شمارہ شائع ہُوا مگر ساتھ ہی دس ہزار روپے کی ضمانت مانگ لی گئی۔ ضمانت داخل نہ کرائی گئی اور اس طرح "الہلال" بند ہو گیا۔ پانچ ماہ بعد مولانا نے البلاغ پریس اور ہفتہ وار البلاغ جاری کیا۔ البلاغ کا پہلا شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو چھپا۔ اس کے صفحۂ اوّل پر اقبال کی یہ نظم چھپی :

محل ایسا کیا تعمیر عُرفی کے تخیّل نے
تصدّق جس پہ حیرت خانۂ سِینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اُس نے نوا ایسی
میسّر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنّابی
مرے دِل نے یہ اِک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی
تغیّر آگیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں
کہ رخصت ہو گئی دُنیا سے کیفیت وہ سیمابی

فغانِ نیم شب شاعر کی، بار گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیوں کر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی
صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم کن
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

"البلاغ" میں اس نظم کا عنوان عرفی کے شعر کا مصرعہ اولیٰ تھا۔ بانگِ درا میں یہ "عرفی" کے عنوان سے چھپی۔ بانگِ درا میں اسے شامل کرتے وقت چند اشعار میں ترامیم کی گئیں جو یہ ہیں :

البلاغ : میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی
بانگِ درا : میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشکِ عنابی
البلاغ : تغیر آ گیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں
بانگِ درا : مزاجِ اہلِ عالم میں تغیر آ گیا ایسا
البلاغ : صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم کن
بانگِ درا : صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم گو

یہ حقیقت ہے کہ الہلال اور البلاغ کے صفحۂ اول پر کبھی کوئی نظم شائع نہیں ہوئی۔ صرف اقبال کی نظم کو یہ مستثنیٰ مقام حاصل ہوا۔ شبلی سے مولانا آزاد کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کی متعدد نظمیں الہلال میں چھپیں مگر پہلا صفحہ اقبال کے سوا کسی کو نہ ملا۔ اس نظم میں مولانا آزاد کو جو پیغام دیا گیا وہ محتاجِ تشریح نہیں۔

حکومت نے محسوس کیا کہ محض پریس ایکٹ کے استعمال سے مولانا آزاد کی سرگرمیاں رُک نہیں سکتیں سو اس بار قانون تحفّظِ ہند کی دفعہ ۳ کے تحت انھیں کہا گیا کہ چار دن کے اندر اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دیں اور حدودِ بنگال سے نکل جائیں۔ بعد میں یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھا دی گئی۔ اس سے پہلے حکومتِ پنجاب، دہلی، یوپی اور بمبئی اسی قانون کے تحت مولانا کا داخلہ اپنے صوبوں میں بند کر چکی تھیں۔ چنانچہ مولانا رانچی (بہار) چلے گئے جہاں پانچ ماہ بعد نظر بند کر دیئے گئے۔ اس طرح ساڑھے چار مہینے بعد البلاغ بند ہو گیا۔

مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے کہ اقبال کی مثنوی "رموزِ بے خودی" چھپی۔ اقبال نے اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد کو بھیجا اور انھوں نے ایک خط میں اسے بہت پسند کیا۔ اقبال سیّد سلیمان ندوی کے نام ۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"والا نامہ ابھی ملا ہے، رموزِ بے خودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں۔"[1]

آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے، انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے.....

مولانا آزاد کا تذکرہ ۱۹۱۹ء میں ان کے زمانۂ اسارت ہی میں چھپا۔ فضل الدین احمد مرزا نے مقدمہ میں "مذہبی انقلاب" کے زیرِ عنوان "الہلال" کے اثرات کے بارے میں لکھا:

"[2] مثال کے طور پر میں صرف چند محترم ناموں کا ذکر کروں گا۔ طبقۂ علما میں سے حضرۃ مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی کا یہ قول خود مولانا ابوالکلام نے ایک مرتبہ مجھ سے نقل کیا تھا کہ "ہم سب اصل کام بھولے ہوئے تھے، الہلال نے یاد دلایا"..... تعلیم یافتہ

[1] شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ حصہ اول (لاہور۔ شیخ محمد اشرف۔ س۔ن) ص ۸۰

[2] فضل الدین احمد مرزا "مقدمہ" تذکرہ ابوالکلام آزاد (کلکتہ۔ البلاغ پریس ۱۹۱۹ء) ص ر، ز

جماعت میں فدائے قوم مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی خاں اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ان دونوں اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اسی نے دکھلائی، اور بتدریج اپنے رنگ میں یک قلم رنگ دیا...... ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" فی الحقیقت "الہلال" ہی کی صدائے بازگشت ہیں

اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کے خط میں جہاں تذکرہ مولانا آزاد اور تحریکِ الہلال کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے وہاں فضل الدین احمد مرزا کی مندرجہ بالا تحریر پر خفگی کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا، بہت دلچسپ کتاب ہے مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریکِ الہلال ہی کی آوازِ بازگشت ہیں"۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میں مطبوعہ تحریریں، نظم و نثر، انگریزی و اردو موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہ تھیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری البتہ اس بات سے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا تحریکِ الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سُنے گئے اُن میں اور مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے"۔ معلوم نہیں انھوں نے کیا سُنا تھا اور سُنی سنائی بات

پر اعتبار کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہوں کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں. مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں ورنہ یہ مؤخر الذکر شکایت براہِ راست ان سے کرتا. اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچا دیجیے" [1]

تذکرہ مولانا کی رائے اور مرضی کے خلاف فضل الدین احمد مرزا نے شائع کر دیا تھا. مولانا پورا چھاپنا چاہتے تھے. فضل الدین احمد نے مختلف اجزا روک لیے اور مولانا کے بیان کے مطابق دُوسری جلد کا مسودہ بھی اُنھیں کے پاس تھا. مولانا کی رہائی سے پیشتر موصوف پنجاب آ گئے، پھر اُن کا انتقال ہو گیا. مسودہ تلاش کے باوجود نہ مل سکا. مولانا آزاد، مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام ۲۶ نومبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"..... تذکرہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی. ایک صاحب نے بطورِ خود شائع کر دیا. بوجوہ اس کی اشاعت میرے لیے خوش آیند نہ ہوئی" [2]

معلوم نہیں سیّد سلیمان ندوی اقبال کی شکایت فضل الدین احمد مرزا تک پہنچا سکے یا نہیں. البتّہ مولانا آزاد کو ضرور پہنچائی. اس پر مولانا آزاد نے سیّد سلیمان ندوی کو ۲ جنوری ۱۹۲۰ء کو لکھا:

"..... ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں. یہ نہایت ہی لغو اور سُبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یُوں تبدیلی ہوئی لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے ـــ

---

[1] شیخ عطاء اللہ. اقبال نامہ حصہ اول (لاہور. شیخ محمد اشرف، س.ن) ص ۱۱۰ - ۱۱۱

[2] غلام رسول مہر. تبرکاتِ آزاد (لاہور. شیخ غلام علی، ۱۹۵۹ء) ص ۱۰۱

دراصل اس کمبخت تذکرے کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔
مسٹر فضل الدین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظرثانی کے لیے بھیجا تھا، میں نے واپس
نہیں بھیجا، اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کا پہلا حصّہ شائع کرنا چاہتے
تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے۔
صرف اتنا ٹکڑا حد درجہ ضمنی سطولات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ
ہوگا۔ خیال کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا لیکن انھوں نے
بجنسہٖ چھاپ کر، جلد باندھ کر، یکایک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں
کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے ٹکڑے کے پورا مقدمہ
طرزِ تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔" [۱]

مولانا یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے تو اقبال کو اس کی خوشی ہوئی اور انھیں خط بھی
لکھا۔ سیّد سلیمان ندوی کے نام ایک [۲] خط میں لکھتے ہیں :

"..... الحمدللہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی۔ کیف باطن میں بالخصوص
آج کل "صحو" ہی کی ضرورت ہے۔ نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی تربیت
اسی حال میں کی تھی۔ "سکر" کی حالت عمل کی دشوار گزار منزل کو طے کر لینے
کے بعد ہو تو مفید ہے۔ باقی حالات میں اس کا روح پر ایسا ہی اثر ہے
جیسا جسم پر افیون کا۔ مولانا آزاد اب کہاں ہیں۔ پتہ لکھیے کہ ان کی خدمت

---

[۱] غلام رسول مہر۔ تبرکات آزاد (لاہور۔ شیخ غلام علی ۱۹۵۹ء) ص ۱۵۶

[۲] اقبال نامہ میں اس خط کی تاریخ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء درج ہے، جو درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ مولانا آزاد یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے تھے۔

میں عریضہ لکھوں ....." [1]

اقبال مولانا آزاد سے بھی مسائل و مشکلات میں مشورہ کرتے تھے اور ان کی رائے کو وقیع جانتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کے نام ۱۸ اگست ۱۹۲۴ء کے خط میں رقمطراز ہیں:

" حال میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی (کولمبیا) نے ایک کتاب شائع کی ہے، جس کا نام "مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات" ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماعِ امت نصِ قرآنی کو منسوخ کرسکتا ہے، یعنی یہ کہ مثلاً مدت شیر خوارگی جو نص صریح کی رُو سے دو سال ہے کم یا زیادہ ہوسکتی ہے یا حصصِ شرعی میراث میں کمی بیشی کرسکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے۔ کہ بعض حنفاء اور معتزلین کے نزدیک اجماع یہ اختیار رکھتا ہے مگر اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟ امر دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے؟ میں نے مولوی ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے۔ [2]

اقبال نہ صرف خود مسائل و مشکلات میں مولانا آزاد سے مشورہ کرتے بلکہ دوسروں کو بھی ان سے رجوع کرنے کا کہتے۔ سید محمد سعید الدین جعفری کے نام ایک خط میں "اسلام کا مطالعہ زمانۂ حال کی روشنی میں" کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

" میری رائے میں بحیثیت مجموعی زمانۂ حال کے مسلمانوں کو امام ابنِ تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں مگر شاہ صاحب موصوف کی حجۃ اللہ البالغہ کا اُردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ حکما میں ابن رشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے

---

[1] شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ حصہ اول (لاہور۔ شیخ محمد اشرف، س۔ن) ص ۱۰۰ - ۱۰۱

[2] ایضاً۔ ص ۱۳۲ - ۱۳۳

علیٰ ہٰذا القیاس غزالی اور رُومی علیہم الرحمۃ۔ مفسرین میں معتزلی نقطۂ خیال سے زمخشری، اشعری نقطۂ خیال رازی اور زبان و محاورہ کے اعتبار سے بیضاوی ..... چند مفسرین کے نام میں اُوپر لکھ چکا ہُوں۔ میری رائے میں سیّد سلیمان ندوی اور مولانا ابُوالکلام اس بارے میں بہتر مشورہ دے سکینگے"۔ [۱]

سیّد سُلیمان ندوی کے نام، اگست ۱۹۳۶ء کے خط میں مولانا آزاد کا ذکر ہے اقبال لکھتے ہیں :

"الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے .....،" [۲]

افسوس کہ فریقین کی خط و کتابت محفوظ نہیں جس کی وجہ سے ان بزرگوں کے تعلقات کی تفصیلات نامعلوم ہیں۔ البتہ یہ بات تو یقینی ہے کہ انھوں نے ایک دُوسرے کے وجود کا انکار نہیں کیا۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ "امام الہند نے تذکرہ سے لے کر غبارِ خاطر تک اپنی نثر کو فارسی اُردو کے متعدد شعرا کے شعروں سے مزیّن کیا ہے لیکن اگر نہیں کیا تو علامہ اقبال کے شعروں سے نہیں کیا۔"

میرے خیال میں یہ رائے درست نہیں۔ مولانا نے غبارِ خاطر میں ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کے مکتوب میں اقبال کا یہ شعر استعمال کیا ہے۔

تا تو بیدار شوی ، نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغان نیز کنند

---

[۱] رفیع الدین ہاشمی۔ خطوطِ اقبال (لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۶ء) ص ۱۶۳، ۱۶۷

[۲] شیخ عطاءاللہ۔ اقبال نامہ حصہ اول (لاہور، شیخ محمد اشرف س،ن) ص ۱۹۹

ویسے بھی زیادہ تر وہی اشعار انسان کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں جو ابتدائی دور میں نظر سے گزر چکے ہوں۔

۱۹۰۵ء کی پہلی ملاقات کے علاوہ اقبال اور ابوالکلام کی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ چند ایک کی تفصیلات یہ ہیں:

۱۹ فروری ۱۹۱۴ء[1] کو مولانا آزاد انجمن ہلالِ احمر قسطنطنیہ کے وفد کے ساتھ لاہور آئے اور اقبال سے ملاقات بھی ہوئی۔ یہ وفد مسلمانانِ ہند کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر وفد کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ شام چار بجے باغ بیرونِ موچی دروازہ میں جلسہ عام منعقد ہُوا۔ ارکینِ وفد اور مولانا آزاد جب جلسہ گاہ میں آئے تو حاضرینِ جلسہ کی طرف سے اُن کے گلے میں ہار ڈالے گئے اور بے شمار پھول برسائے گئے۔ اس کے بعد حاجی شمس الدین سیکرٹری انجمن حمایتِ اسلام لاہور نے نواب ذوالفقار علی خان رئیس مالیر کوٹلہ و سابق وزیرِ اعظم ریاست پٹیالہ کے صدرِ جلسہ بنائے جانے کی تجویز پیش کی جو اقبال کی تائید سے باتفاق رائے حاضرین منظور ہوئی۔ نواب ذوالفقار علی خاں نے افتتاحی تقریر کی، ان کے بعد ڈاکٹر عدنان بے اور عمر کمال بے نے ترکی میں تقاریر کیں جن کا ترجمہ علامہ توفیق بے اڈیٹر رسالہ "سبیل الرشاد" قسطنطنیہ نے فارسی میں سُنایا۔ ان کے بعد چودھری غلام حیدر خان پرسنل اسسٹنٹ ایڈیٹر زمیندار اور حاجی شمس الدین نے تقاریر کیں۔ مولانا آزاد وفد کے ہمراہ اسی شام واپس چلے گئے کہ دُوسرے دن دہلی میں بھی جلسہ ہو رہا تھا۔ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خان نے مولانا آزاد پر زور دیا کہ مزید ایک روز لاہور میں قیام فرمائیں۔

ایک ملاقات کے راوی ڈاکٹر شیر بہادر خان ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ مولانا لاہور تشریف لائے اور حسبِ معمول میاں عبدالعزیز

---

[1] شمشیرِ قلم، ۲۷ فروری ۱۹۱۴ء ص ۳

بار ایٹ لا، کی کوٹھی پر فروکش ہُوئے۔ ان کے ہاں خواص کی ایک مجلس عصر کے قریب منعقد ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ علّامہ اقبال بھی وہاں موجود تھے۔ اس محفل میں مَیں اور میرا ایک دوست بھی جا پہنچے۔ مولانا نے وقت کے کسی مسئلہ پر (وہ مسئلہ اب ٹھیک یاد نہیں) فرش پر بیٹھے بیٹھے تقریر کی۔ جب تقریر کر چکے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ علامہ اقبال سے مخاطب ہُوئے اور استفسار کیا "کیوں علامہ صاحب آپ کی کیا رائے ہے"؟ علامہ مرحوم نے فرمایا "مولانا مجھے آپ سے کُلّی اتفاق ہے" [1]

ایک اور ملاقات کے راوی مولانا غلام رسول مہر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک ملاقات میرے سامنے نواب سر ذوالفقار علی خان مرحوم کی دعوتِ طعام پر ہوئی تھی۔ حضرت علامہ نے بطورِ خاص فرمایا تھا کہ ہمیں مولانا آزاد کے پاس بٹھایا جائے تاکہ ان سے باتیں کر سکیں۔ مَیں نے اس کا انتظام کیا اور کھانے کے دوران میں دونوں بزرگ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔" [2]

یہ تو تھی اقبال اور ابوالکلام کی خط و کتابت اور ملاقاتوں کی داستان جس سے زندگی میں ان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کا انتقال ہو گیا۔ مولانا آزاد کو اس کا شدید صدمہ ہُوا۔ مولانا نے ایک بیان میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اقبال کو یُوں خراجِ تحسین پیش کیا:

"یہ تصور کس قدر المناک ہے کہ اقبال اب ہم میں نہیں۔ جدید

---

[1] چٹان، ابوالکلام نمبر، ۱۵ فروری ۱۹۶۵ء ص ۱۷

[2] مکتوب مولانا غلام رسول مہر بنام فیض لدھیانوی مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء

ہندوستان اُردو کا اس سے بڑا شاعر پیدا نہیں کرسکتا۔ اس کی فارسی شاعری کا بھی جدید فارسی ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔ یہ تنہا ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ پورے مشرق کا نقصان ہے۔ ذاتی طور پر میں ایک پُرانے دوست سے محروم ہو گیا ہوں" [۱]

۲۵ اپریل ۱۹۳۸ء کو مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام ایک خط میں بھی اس سانحہ پر ان الفاظ میں اظہارِ افسوس فرمایا:

" اقبال کی موت سے نہایت قلق ہُوا۔
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں" [۲]

کتابیات

(۱) اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد اول حصہ دوم لاہور۔ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۲ء

(۲) آزاد، ابوالکلام۔ تذکرہ۔ کلکتہ۔ البلاغ پریس، ۱۹۱۹ء

(۳) آزاد، ابوالکلام۔ غبارِ خاطر۔ دلی۔ ساہتیہ اکادمی، ۱۹۶۷ء

(۴) آزاد، ابوالکلام۔ انڈیا ونس فریڈم (انگریزی) کلکتہ۔ لانگ مین، ۱۹۶۴ء

(۵) اقبال، محمد اقبال سر۔ بانگِ درا۔ لاہور۔ شیخ غلام علی، ۱۹۵۸ء

(۶) اقبال، محمد اقبال سر۔ زبورِ عجم۔ لاہور۔ شیخ غلام علی، ۱۹۶۰ء

---

[۱] عبداللہ انور بیگ۔ دی پوئٹ آف دی ایسٹ (انگریزی) (لاہور اسلامک پبلیکیشنز ۱۹۵۶ء) ص ۵۶

[۲] غلام رسول مہر۔ تبرکاتِ آزاد (لاہور۔ شیخ غلام علی ۱۹۵۹ء) ص ۱۶

(۷) عبداللہ انور بیگ ۔ دی پوئٹ آف دی ایسٹ لاہور ۔ اسلامک پبلیکیشنز ، ۱۹۵۶ء

(۸) عبداللہ سید ۔ مسائل اقبال ۔ لاہور ۔ اردو اکیڈمی ۱۹۷۴ء

(۹) عطاء اللہ شیخ ۔ اقبال نامہ ، حصہ اول ۔ لاہور ۔ شیخ محمد اشرف (س ۔ ن)

(۱۰) ملیح آبادی عبدالرزاق ۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی ۔ لاہور ، مکتبہ چٹان ۱۹۶۰ء

(۱۱) مہر ، غلام رسول ۔ تبرکات آزاد ۔ لاہور ، شیخ غلام علی ، ۱۹۵۹ء

(۱۲) ہاشمی ، رفیع الدین ۔ خطوط اقبال ۔ لاہور ، مکتبہ خیابان ادب ، ۱۹۷۶ء

(ب) رسائل و اخبار

(۱) البلاغ ۔ کلکتہ ۔ ۱۹۱۵ء

(۲) الہلال ۔ کلکتہ ۔ ۱۹۱۲ء ، ۱۹۱۴ء

(۳) الجمعیتہ ۔ دلی ۔ ۱۹۵۸ء

(۴) چٹان ۔ لاہور ۔ ۱۹۶۷ء

(۵) شمشیر قلم ۔ لاہور ۔ ۱۹۱۴ء

(مطبوعہ "نقوش" لاہور)

شورش کاشمیری

اقبالؒ اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

"اَج او ہوندا، تے ایناں کرگساں نوں دسدا کہ بخاری غدّار اے کہ فدا کار۔ میں کنوں کواں، میرے تے ساتھی ای میرے کولوں وِچھڑ گئے تے یاں پچھڑ گئے نے"۔

علامہ اقبال کا ذکر ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ "اقبال زندہ ہوتا تو پھر ان کرگسوں کو بتاتا کہ بخاری غدّار ہے یا فدا کار۔ میں کیسے کہوں کہ میرے ساتھی ہی مجھ سے بچھڑ اور پچھڑ گئے ہیں۔

شاہ جی فرماتے تھے، جب کبھی میں اُن کے ہاں حاضر ہوتا وہ چارپائی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھے ہوتے، حقّہ سامنے ہوتا، دو چار کرسیاں بچھی ہوتیں، صدا دیتا۔ یا مُرشد! فرماتے، آ بھئی پیرا، بہت دناں بعد آیاں ایں (بہت دنوں بعد آئے ہو) علی بخش سو کہتے حُقّہ لے جاؤ اور کلّی کے لیے پانی لاؤ، کلّی فرماتے پھر ارشاد ہوتا، ایک رکُوع سناؤ، میں پوچھتا حضرت! کوئی تازہ کلام؟ فرماتے، ہوتا ہی رہتا ہے۔ عرض کرتا، لائیے، کاپی منگواتے، پہلے رکُوع سنتے، پھر وہ اشعار، جو حضورؐ سے وابستہ ہوتے۔ قرآن پاک سُنتے وقت کانپنے لگتے تھے لیکن جب حضورؐ کا ذکر ہوتا یا ان سے متعلق کلام پڑھا جاتا تو چہرہ اشکبار ہو جاتا۔ حضورؐ کا ذکر ہمیشہ باوضو شخص سے سُنتے اور خود اُن کا نام بھی باوضو ہو کر لیتے تھے۔ حضورؐ

کے ذکر پر اس طرح روتے جس طرح ایک معصوم بچہ ماں بغیر روتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

افراد و اشخاص اور واقعات و حالات کے بارے میں اُن کا تجربہ حیرت انگیز طور پر درست ہوتا تھا۔ شاہ جی کا بیان ہے کہ مجھ سے اکثر لوگوں کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے اور ان کی سیرتوں کا اجمالی خاکہ پیش فرماتے، سرکار کی بیشتر باتیں انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچتی تھیں۔ پہلے خود ہی طرح دیتے پھر احتراز فرماتے۔ بھئی دلّی دروازے کے باغ میں لوگوں کو بتا دو گے؟ پھر بتا بھی دیتے، فرماتے، اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ لُطف یہ تھا کہ اپنے سبھی معتمدین کو بتاتے چلے جاتے اور سبھی کو یہ مشورہ دیتے کہ اپنے آپ تک محدود رکھنا اور جب بات بکھر جاتی تو فرماتے، تم لوگ راز نہیں رکھ سکتے ہو؟ عرض کی جاتی کہ آپ ہی نے تو فلاں فلاں کو بتایا ہے، پھر مسکراتے۔ اچھا تو عام ہو جانے دو، اس میں راز کی کون سی بات ہے؟

⁂ ⁂ ⁂

ایک دفعہ (بروایت شاہ جی) جلسوں کی رونق پر گفتگو کرتے رہے، کہنے لگے عامۃ المسلمین میں بڑی جان ہے۔ اس قوم کا مزاج حرارت سے بنا ہے، یہ بجھنے کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ ساری خرابی لیڈر شپ کی ہے۔ خواص تو خیر عضوِ معطّل ہیں، انھیں اپنے جسم کا عیش چاہیے۔ لیڈر گم کردہ راہ ہیں۔ لوگوں کو صحیح راستہ پر نہیں لاتے۔ عرض کیا، حضرت یہ بھی آپ نے مفروضہ قائم کر لیا ہے، قوم خود ہی صحیح راہ پر نہیں آتی؟ آپ کیلئے عامۃ المسلمین کس طرح تڑپتے ہیں لیکن آپ مجمع میں آتے ہی نہیں؟

"نہیں، پیر جی، یہ بات نہیں۔ میرا مجمع میری کتابیں ہیں، میں ہجوم و افکار میں اس طرح کھڑا رہتا ہوں کہ بسا اوقات فرصت کے اوقات ہی عنقا ہو جاتے ہیں"

"ٹھیک ہے مُرشد! میں نے تو کبھی اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے"۔
"اوشاہ جی تُساں تے دِلاں تے دماغاں دیاں مٹی جھاڑ دے او" (شاہ جی! آپ تو دِلوں اور دماغوں کی گرد جھاڑتے ہو)

شاہ جی نے یہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، فرمایا ہائے کیا انسان تھا جدید دانش اور قدیم حکمت کا نقطۂ معراج، چونکہ میاںؒ سے محبت کرتے تھے اس لیے اللہ نے اُن پر علم و دانش اور فکر و نظر کی سبھی راہیں کھول دی تھیں۔ وہ میدان کا کھلاڑی نہیں تھا لیکن علم اس کا خانہ زاد تھا۔

٭ ٭ ٭

آج جو پشتینی وفادار — شاہ جی نے فرمایا۔ اُس کا نام لے لے کر اُس کے ہمنشینوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا رہے ہیں، کسی علمی مسئلے پر اقبال نے کبھی اُن سے مخاطبت کی؟ کبھی ان سے کوئی دینی سوال کیا، کبھی ملی اُمور پر ان سے از خود گفتگو کی، کبھی مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ان سے زیرِ بحث لاتے رہے؟ اُن کے ساتھ تو اُن کے زیادہ سے زیادہ لا نغر قسم کے مجلسی روابط تھے۔

شاہ جی نے کہا — یہی وہ لوگ جو اقبال کی راہ میں ہمیشہ مزاحم ہوتے رہے۔ انہی لوگوں نے اقبال کے خلاف مخبریاں کی تھیں اور انھیں کسی منصب پر فائز نہیں ہونے دیتے تھے۔ اقبال نے مجھ سے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا تھا۔

شاہ جی نے بتایا، یہ بیان کرتے ہی اُن کا بدن کانپنے لگا، کہ انسان مخالفت اور مخاصمت میں کس حد تک سنگدل، سیہ رو اور گندہ ضمیر ہو جاتا ہے۔

٭ ٭ ٭

شاہ جی کی روایت ہے کہ فرنگ دشمنی سے اُن کے خون کا قطرہ قطرہ انگار دں

میں ڈھلا ہُوا تھا، وہ یورپی تہذیب، یورپی دانش، یورپی سیاست اور یورپی سج دھج کے سخت دشمن تھے، کہا کرتے تھے کہ ہمارا مغرب زدہ طبقہ اپنے خصائص کھو چکا ہے اس کے اندر مشرق کی رُوح بالکل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی خودی اپنی قیمت کھو بیٹھی ہے۔ لوگ علم کی سنجیدگی سے ہاتھ اُٹھا کر نٹوں کا تماشا دیکھنے میں غلطاں ہیں۔

کاسہ لیس خاندانوں کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے۔ یہ طنطنہ میں نے صرف انہی میں دیکھا کہ جن سے نفرت کرتے، انھیں اپنے گھر میں بھی گھُسنے نہیں دیتے تھے اور اگر کوئی کسی بہانے چلا آتا تو اُسے دھتکار کر نکال دیتے، ورنہ مُنہ نہیں لگاتے تھے۔

ایک دفعہ فرمایا، شاہ جی میں مطمئن ہُوں کہ میرا کلام لوگوں کے رگ وپے میں اُتر رہا ہے لیکن ابھی کارواں تیار ہو رہا ہے، ابھی کارواں بنا نہیں۔ سفر، راستہ اور منزل تو دُور کی چیزیں ہیں، جب تک مشرق، مغرب کی ذہانت کو للکارے گا نہیں، اُس وقت تک مشرق کی عظمت کا سُورج نہ کبھی اُبھر سکتا ہے اور نہ اُس کے نصف النہار پر پہنچنے کا سوال ہی زیرِ غور آسکتا ہے۔

شاہ جی یہ عموماً فرماتے:

" کاش اقبالؔ آج زندہ ہوتے۔ ان کا دماغ ایک عظیم الشان تنہائی کا عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ جب کبھی ان کی ہمنشینی کا موقع ملتا معلوم ہوتا تھا کہ لالہ زار کھُل گیا ہے۔

٭ ٭ ٭ مطبوعہ سالنامہ "چٹان" ۱۹۶۲ء لاہور)

جناب مولانا حکیم فضل الرحمن صاحب سواتی مقیم آمبور جنوبی ہند

ڈاکٹر محمد اقبال کی چند تنقیدات و ترجیعات

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال　　پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمۃ بڑے جوشیلے اور جذباتی آدمی تھے، جب کبھی اپنے نظریے کے خلاف کسی میں کوئی بات دیکھ لیتے تو فوراً جوش میں آ کر اُس پر تنقید فرماتے چونکہ وہ صرف جوشیلے اور جذباتی تھے، ضدی نہ تھے، اس لیے پھر اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ میں غلطی پر ہوں یا یہ معلوم ہو جاتا کہ لوگ ان کی تنقید کو پسند نہیں کرتے تو فوراً اس سے رجوع فرماتے اور آئندہ اشاعت سے اُس تنقید کو خارج کر دیتے، اس موقع پر میں چند تنقیدات و ترجیعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) ڈاکٹر محمد اقبال کی پہلی تصنیف مثنوی کی اسرارِ خودی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے جب اخبارات میں اس کا ذکر دیکھا تو فوراً اُسے منگوا لیا اور غور سے دیکھا اُس میں دو تنقیدیں تھیں، ایک تو خواجہ حافظِ شیراز پر، اور دُوسری صوفیائے کرام پر، حافظ شیراز پر بہت سخت تنقید تھی، پینتیس عدد اشعار اس بارے میں درج تھے، یہ تنقید مجھے سخت ناگوار گزری، فوراً ایک خط جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں لکھا کہ کتاب اچھی ہے، لیکن خواجہ حافظ پر جو تنقید ہے وہ ٹھیک نہیں ہے، صوفیائے کرام پر جو تنقید تھی اُس کا

جواب خواجہ حسن نظامیؒ نے اپنے ماہانہ رسالہ نظام المشائخ میں بہت بسط اور شرح کے ساتھ دیا پھر اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اخبار وکیل امرتسر میں دیا، اسی طرح تین بار جواب خواجہ حسن نظامیؒ نے دیا اور تین بار ڈاکٹر صاحب نے جواب لکھا، یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مجھے اپنے وطن سوات جانے کی ضرورت پڑی چنانچہ ماہ اگست ۱۹۱۷ء میں لاہور پہنچا اور جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے جو خط دربارۂ تنقیدی اشعار بابت خواجہ حافظِ شیراز لکھا تھا، اُس کا جواب نہیں آیا، آپ نے فرمایا کہ اس قسم کے متعدد خطوط ہند اور بیرونِ ہند سے آئے ہیں، ایک خط جو لندن سے مسٹر حسین قدوائی نے انھیں لکھا تھا اور اُسی دن انھیں ملا تھا نکال کر سُنایا، انھوں نے لکھا تھا کہ مثنوی اسرارِ خودی کو میں نے پڑھا، کتاب بہت بہتر ہے لیکن خواجہ حافظ شیراز پر جو تنقید ہے وہ درست نہیں ہے پھر جناب ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب لوگ پسند نہیں کرتے تو آئندہ ایڈیشن سے اُن اشعار کو خارج کر دوں گا، لوگوں کی خاطر مجھے ایسا کرنا پڑے گا ورنہ حافظ شیراز کے متعلق میرا نظریہ وہی ہے جس کا اظہار میں نے تنقیدی اشعار میں کیا ہے پھر آپ نے فرمایا کہ حافظ نے اپنی ہستی کا ستیاناس کر دیا معشوق کے سامنے اپنے آپ کو کُتا ثابت کر دیا ہے، چنانچہ انھوں نے یہ شعر سُنا دیا ؎

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی چرا بگردنِ حافظ نمی نہی رسنے

میں نے کہا کہ یہ شعر مجاز نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا میں نے سُنا ہے کہ تم فساق و فجار کو اپنی آغوشِ رحمت میں لیتے ہو، حافظ جو فاسق و فاجر ہے اُسے کیوں اپنی آغوشِ رحمت میں نہیں لیتے، یہ سُن کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ تو خاص آدمی ہیں مگر معاملہ تو عوام سے ہے، میں نے کہا کہ دیوانِ حافظ بھی تو عوام کی چیز نہیں بلکہ خواص کی ہے، آپ نے فرمایا کہ اطمینان رکھیے مرزا ہر دوران

تنقیدی اشعار کو حذف کردوں گا، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، وہ تنقیدی اشعار یہ ہیں، غور سے ملاحظہ فرمائیں ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار — جانش از زہر اجل سرمایہ دار

رہن ساقی خرقۂ پرہیز او — مے علاج ہول رستاخیز او

نیست غیر از بادہ در بازار او — از دو جام آشفتہ شد دستار او

چوں حباب از بادۂ گلگوں شود — مایہ دار حشمت قاروں شود

مفتیِ اقلیم او مینا بدوش — محتسب ممنون پیر مے فروش

طوف ساغر کرد مثل رنگ مے — خواست فتویٰ از رباب چنگ و نے

در رموز عیش و مستی کاملے — از مئے خوں در دلے پا در گلے

رخت شغل ساغر و ساقی گزاشت — بزم رندان و مے باقی گزاشت

چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزل جاناں شدید

در محبت پیرو فرہاد بود — برلب او شعلۂ فریاد بود

تخم نخل آہ در کہسار کاشت — طاقت پیکار با خسرو نداشت

مسلم و ایمان او زنار دار — رخنہ اندر دلش از مژگان یار

آنچناں مست شراب بندگی ست — خواجہ و محروم ذوق خواجگی ست

دعوی او نیست غیر از قال و قیل — دست او کوتاہ و خرما بر نخیل

آں فقیہ ملت مے خوارگاں — آں امام امت بے چارگاں

گوسفند است و نوا آموخت است — عشوۂ و ناز و ادا آموخت است

دل ربائی ہائے او زہر ست و بس — چشم او غارت گر شہر ست و بس

ضعف را نام توانائی دہد — ساز او اقوام را رسوا کند

از بزِ یوناں زمیں زیرک تر است — پردۂ عودش حجابِ اکبر است

نغمۂ چنگش دلیلِ انحطاط — ہاتفِ او جبرئیلِ انحطاط

بگذر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن دارد حشیش

از تخیل جنتے پیدا کند — مرترا بر نیستی شیدا کند

ناوک اندازے کہ تاب از دل برد — ناوکِ او مرگ را شیریں کند

مار گلزارے کہ دارد زہرِ ناب — صید را اوّل ہمے آرد بخواب

عشق با بحرِ نگاہش خود کشی ست — کشتنش مشکل کہ مارِ خوانگی ست

حافظ جادو بیاں شیرازی است — عرفیِ آتش بیاں شیرازی است،

ایں سوی ملکِ خرد مرکب جہاند — آں کنارِ آبِ رکنا باد ماند

ایں قتیلِ ہمتِ مردانۂ — آں ز رمزِ زندگی بیگانۂ

دست ایں گیرد ز نخچہ خوشۂ — چشم آں از اشک دارد توشۂ

روزِ محشر زرحم اگر گوید بگیر — عرفیا فردوس و حور او حریر

غیرتِ او خندہ بر حورا زند — پشت پا بر جنتِ الما زند

بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز — زندۂ از صحبتِ حافظ گریز

ایں فسوں خواں زندگی از مار بود — جامِ او شاں جمی از مار بود

محفلِ او در خورِ ابرار نیست — ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر — الحذر از گوسفنداں الحذر

دیکھا آپ نے کس قدر سخت تنقید ہے؟ جسے میری طرح معتقدینِ حافظ برداشت نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے متذکرہ بالا تنقیدی اشعار کو "مثنوی اسرارِ خودی" سے خارج تو کر دیا مگر حافظ کے متعلق اُن کا جو نظریہ ہے اُس میں کوئی فرق نہیں آیا، اگرچہ حافظ کو انھوں

نے تنقیدی اشعار میں جادو بیان کہا ہے لیکن دونوں کے نظریہ کے اختلاف کی وجہ سے ان کا دل حافظ کے متعلق صاف نہیں ہوا ہے۔ کئی بار انھوں نے حافظؒ کے اشعار پر تضمینیں کی ہیں مگر حافظ کا نام نہیں لیا ہے "کلیات" میں "نصیحت" کے عنوان سے جو نظم ہے اُس میں اخیر کا شعر حافظ کا ہے ؎

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشانست　　　حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

"خطاب بہ نوجوانانِ اسلام" میں یہ مصرعہ حافظ کا ہے۔ ؏

"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت رُوئے زیبا را

"قربِ سُلطان" کی نظم میں یہ مصرعہ حافظ کا ہے۔ ؏

"گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش"

اور یہ شعر بھی حافظ کا ہے ؎

محلِّ نُورِ تجلّی ست رائے انورِ شاہ
چو قُربِ او طلبی در صفائے نیّت کوش

"ارتقاء" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا دوسرا مصرعہ بادنیٰ تصرف حافظ کا ہے۔

؏ "چراغِ مصطفوی سے شرارِ بُولہبی

ایک خط کے جواب میں جو نظم ہے اُس میں اخیر کا شعر حافظ کا ہے ؎

گرت ہواست کہ با خضر ہم نشیں باشی
نہاں ز چشم سکندر چُوں آبِ حیواں باش

"اسیری" کے عنوان سے جو نظم ہے اُس کا آخری شعر حافظ کا ہے ؎

شہپرِ زاغ و زغن زیبائے قید و صید نیست
کیں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

"طلوعِ اسلام" کے عنوان سے جو نظم ہے اُس کا اخیر شعر حافظؔ کا ہے ؎

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

"ظریفانہ" نظم کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا اخیر شعرِ حافظؔ کا ہے ؎

دلقِ حافظ بچہ ارزد بہ میش رنگیں کن
وانگہش مست و خراب از رہِ بازار بیار

میرے حافظ میں جو نظمیں تھیں اور جن میں حافظؔ کے اشعار پر تضمینیں تھیں اُنھیں میں نے لکھا، ممکن ہے کہ اور تضمین بھی ہو لیکن مجھے اُن کا علم نہیں ہے اور شعراء کے اشعار پر بھی ڈاکٹر اقبال نے تضمینیں لکھی ہیں، اُن شعراء کا نام صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے مثلاً فرماتے ہیں:

تضمین بر شعرِ انیسی شاملو ؎

وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کردی	ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی

تضمین بر شعرِ صائب ؎

ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد	ندارد تنگنائے شہر تابِ حُسنِ صحرائی

تضمین بر شعرِ مرزا بیدل ؎

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش ست	ہر چند عقلِ کُل شدۂ بے جنوں مباش

تضمین بر شعرِ ملک قمی ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر	یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

فردوس میں مکالمہ کے عنوان سے جو نظم ہے اُس کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں شیخ سعدی شیرازی کا نام ہے اور دُوسرا شعر تو سعدی ہی کا ہے ؎

اے آنکہ زنور گہر نظم فلک تاب   در من بچراغِ مہ و اختر زدۂ باز

اخیر کا شعر بھی سعدی شیرازی کا ہے ؎

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم

دیبا نتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم

ڈاکٹر اقبال نے خواجہ حافظ شیراز کو کما حقہٗ پہچانا نہیں ہے، اس لیے وہ ان کو شرابی کہتے ہیں حالانکہ کسی نے حافظ کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، نہ گھر کے لوگوں نے اُن کو شراب پیتے ہوئے دیکھا ہے نہ باہر کے لوگوں نے۔ خواجہ حافظ لسان الغیب کے نام سے مشہور ہیں، ایک دفعہ اورنگ زیب عالمگیر کی شاہی مُہر گُم ہوگئی تھی چونکہ وہ بہت قیمتی تھی، جواہرات اُس میں لگے ہوئے تھے، اس کے علاوہ ان کو سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ اگر اُس کو کوئی غلط طریقہ پر استعمال کرے تو حکومت کا بہت زبردست نقصان ہوگا، اسی فکر میں غلطاں و پریشاں تھے، چونکہ ان کو خواجہ صاحب سے کمال عقیدت مندی تھی، اس لیے فال دیکھنے کی غرض سے دیوانِ حافظ اُٹھایا اور کنیز کو پکارا کہ چراغ لے کر آؤ، وہ چراغ لے کر آئی، انھوں نے دیوان کھول کر دیکھا تو یہ شعر نکلا ؎

بفروغِ چہرہ زُلفت ہمہ شب زند رہِ دل

چہ دلاور ست دُزدے کہ بکف چراغ دارد

اُنھوں نے فوراً کنیز کی تلاشی لی تو اُس کی کمر سے مُہر برآمد ہوئی۔

دُور کیوں جائیے، میری ہی حالت سُنیے۔ ۱۹۳۸ء میں میں اپنے وطن سوات میں تھا، یہاں سے میں ۱۹۳۳ء میں گیا تھا میرے چار بچے یہاں آمبور میں اپنے نانا — مُحمّد ہاشم صاحب کے پاس تھے اور میں سوات میں تھا، سوات کے خویش واقارب نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں واپس آمبور نہ جاؤں، میں بڑی کش مکش میں مبتلا تھا کہ واپس جاؤں

یا سوات میں رہوں، آخر دیوان حافظ کھول کر فال نکالا تو یہ شعر نکلا ؎

من از دیارِ حبیبم نہ از دیارِ رقیب مہمنا بہ رفیقان خود رساں بازم

میرے بڑے لڑکے کا نام حبیب الرحمٰن ہے۔ یہ دیکھتے ہی جانے پر آمادہ ہوا لیکن ہاتھ میں رقم نہیں تھی، حیران نقطہ وار دائرہ پرکار میں رہا، گھر سے جب باہر نکلا تو ایک شخص باہر کھڑا میرے انتظار میں تھا، اُس نے ایک سو روپیہ پیش کیا کہ دمہ کی دوا آپ نے جو دی تھی اُس سے بڑا فائدہ ہوا، بیس سال کا دمہ اس سے بالکل ٹھیک ہو گیا، یہ ایک سو روپیہ لے لو اور وہ نسخہ لکھ کر دے دو، چنانچہ کھڑے کھڑے وہ نسخہ لکھ کر میں نے دیدیا اور دوسرے دن مدراس جانے لگا، اُس وقت سے اب تک یہاں آسبور میں ہوں، کوئی صورت اپنے ملک جانے کی نہیں نکلتی۔ اچھا اب دُوسری تنقید اور ترجیع ملاحظہ فرمایئے

(۲) دسمبر ۱۹۲۰ئہ کے اخیر ہفتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں زیر صدارت وجے رگھوا چاریہ منعقد ہوا تھا جس میں مہاتما گاندھی کا نان کو آپریشن والا ریزولیوشن پاس ہو گیا تھا جس کی مخالفت قائدِ اعظم محمدؒ علی جناح نے کی، لوگوں نے اُن پر شیم شیم کی آوازیں کسی تھیں، مَیں نے بھی زور زور سے شرم شرم کی آوازیں بلند کی تھیں جناح صاحب اُسی وقت کانگریس سے نکل گئے، ہندوستان میں اب کوئی ادارہ اُن کے لیے نہیں رہا، مسلم لیگ تو مر چکی تھی، اس کی جگہ خلافت کانفرنس کام کر رہی تھی، مجبور ہو کر آپ لندن تشریف لے گئے، سات آٹھ مہینہ کے بعد لندن سے واپس آ کر اکتوبر ۱۹۲۱ئہ میں بمبئی میں اعلان کر دیا کہ لیگ کو پھر زندہ کر دینا چاہیے، اس اعلان سے ڈاکٹر اقبال بہت برہم ہوئے اور فوراً تنقیدی قطعہ ارشاد فرمایا جو صدائے لیگ کے عنوان سے روزنامہ زمیندار مورخہ ۹، نومبر ۱۹۲۱ئہ میں شائع ہوا، اس وقت کے تمام اُردو اخبارات نے نہایت شاندار طریقے سے شائع کیا اور بہت سے لوگوں کے

ورد زبان رہا، وہ قطعہ یہ ہے جو اس وقت میری نوکِ زبان ہے۔ صدائے لیگ

(از ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال)

لندن کے چرخِ نادرہ فن سے پہاڑ پر
اُترے مسیح بن کے محمد علی جناح

نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی بتا ہمیں
اے جان بر لب آمدہ اب تیری کیا صلاح

دل سے خیالِ دشت و بیاباں نکال دے
مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح

آغا امام اور محمد علی ہے باب
اس دین میں ہے ترکِ سوادِ حرم مباح

بشریٰ لکم کہ منتظرِ ما رسیدہ ہست
یعنی حجابِ غیرتِ کبریٰ دریدہ ہست

(روزنامہ زمیندار مورخہ ۹ نومبر ۱۹۲۱ء)

میں نے علامہ اقبال کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ قطعہ تو بہت اچھا ہے، لیکن جناح صاحب پر اس قدر سخت تنقید غیر مناسب ہے، تمام لوگ قطعہ کو بہت پسند کر رہے ہیں مگر میں اس بارے میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، میں بھی آپ کی طرح جناح صاحب کا مخالف ہوں، ناگ پور میں کانگریس کے اجلاس میں جب اُن پر شیم شیم کی آوازیں کسی گئیں تو میں نے بھی زور سے شرم شرم کی صدا بلند کی۔ میں پکا خلافتی اور کانگریسی ہوں اور وہ ان دونوں کے سخت خلاف ہیں لیکن انھوں نے ۱۹۱۸ء میں جو بہت اہم کام انجام دیا ہے اُس کا اثر میرے دل و دماغ پر بہت زیادہ ہے ۱۹۱۸ء میں وزیرِ ہند لارڈ مانٹیگو جب ہندوستان آئے تھے اور پورے ملک کا انھوں نے دورہ کیا تو ایک رپورٹ لارڈ چیمسفورڈ اور مانٹیگو کے نام سے مرتب کی گئی جس میں سفارش کی تھی کہ ہندوستان میں کافی صلاحیت ہے اس لیے اُسے اصلاحات ملنے چاہئیں اس رپورٹ کی تائید صوبجات کے گورنروں اور لفٹنٹ گورنروں نے کی لیکن بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن نے اس کی مخالفت کی کہ ہندوستان میں اصلاحات کی قابلیت نہیں

ہے۔ ولنگڈن کے اس رویّہ کی کسی نے مخالفت نہیں کی، صرف مسٹر محمد علی جناح ہی تھے جنھوں نے مشرح اور غیر مبہم الفاظ میں مخالفت کی اور لارڈ ولنگڈن کو دشمنِ ہند کہا کہ ایسے دشمن ہند گورنری کے اہل نہیں ہیں، حکومتِ برطانیہ کو چاہیے کہ وہ انھیں واپس بُلائے، جب لارڈ ولنگڈن کی میعادِ گورنری ختم ہوئی اور وہ لندن جانے لگے تو بمبئی کے کارپوریشن کی جانب سے لارڈ موصوف کے اعزاز میں جلسہ منعقد ہُوا، اس موقعہ پر مسٹر محمّد علی جناح اور ان کی بیوی نے کالی جھنڈیوں سے لارڈ ولنگڈن کا استقبال کیا، غیر قوم میں سے کسی کی یہ جرأت نہ ہو سکی لہٰذا میں آپ کی خدمت میں باادب التماس کرتا ہُوں کہ ازراہِ کرم اِس قطعہ کو اپنے مجموعۂ اشعار سے خارج کر دیجیے گا۔

خط لکھ کر دو ہفتے کے بعد جناب ڈاکٹر اقبال کا نوازش نامہ موصول ہُوا جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ واقعی جوش میں آکر چند تنقیدی اشعار لکھ دیے ہیں لیکن آپ کے خط نے میرے جوش کو فرو کر دیا، مَیں آپ کا شکر گزار ہُوں کہ آپ نے بروقت مجھے متنبہ کر دیا، آپ کے سوا اور کسی نے مجھے نہ لکھا ہے اور نہ کسی نے زبانی ہی کچھ کہا ہے، اس بارے میں لکھنے والے آپ فردِ واحد ہیں، اطمینان رکھیے کہ مَیں نے اُن اشعار کو آپ ہی کے کہنے سے اپنے مجموعۂ اشعار سے خارج کر دیا ہے۔

۱۹۲۹ء میں جناب ڈاکٹر اقبال صاحب مدراس تشریف لائے تھے تو مَیں اُن سے ملنے کی غرض سے مدراس گیا اور جناب یعقوب حسن سیٹھ صاحب کی معیت میں اُن سے ملا، سیٹھ صاحب نے میرا تعارف اُن سے کرانا چاہا، آپ نے فرمایا "مَیں انھیں اچھی طرح جانتا ہُوں، یہ اہلِ ایمان میں سے ہیں ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر نکلے اُدھر ڈُوبے، اُدھر ڈُوبے اِدھر نکلے

اور پھر فرمانے لگے، ۱۹۱۷ء میں آپ لاہور آکر مجھ سے ملے ہیں، مَیں نے اسرارِ خودی میں

جو تنقید خواجہ حافظ پر کی تھی اُس بارے میں آپ نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُن تنقیدی اشعار کو مثنوی اسرارِ خودی سے خارج کر دوں چنانچہ ان کے کہنے سے میں نے ان اشعار کو خارج کر دیا پھر ۱۹۲۱ء میں مسٹر محمد علی جناح صاحب پر چند اشعار بطورِ تنقید کہے تھے جنکو تمام اخبارات نے شائع کیا تھا، اُس بارے میں آپ کا ایک خط آیا تھا کہ ان اشعار کو اپنے مجموعہ سے خارج کرو، میں نے ان کے لکھنے سے اُن اشعار کو اپنے کلیات سے خارج کر دیا، میں جانتا ہُوں یہ افغان ہیں، جب کسی بات کے پیچھے لگ جاتے ہیں جب تک اُسے حاصل نہیں کر لیتے، چین سے نہیں بیٹھتے" !

اب ایک تیسری تنقید ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح نے پُل بنگش کے پاس رات کے وقت ایک جلسہ میں تقریر کی تھی جس میں فرمایا تھا کہ آجکل اقوام وطن سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں، جلسہ میں "الامان" کا نامہ نگار بھی تھا۔ اُس نے پُوری رپورٹ مولوی مظہر الدین شیر کوٹی کو سنائی، چونکہ مولوی مظہر الدین مولانا مدنی رح کے سخت مخالف تھے انھوں نے "الامان" میں یہ لکھا:

اکہ رات کے جلسہ میں مولانا مدنی رح نے کہا کہ ملتیں وطن سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں بنتیں، چونکہ یہ بات ڈاکٹر اقبال کے نظریے کے سخت خلاف تھی اس لیے جوش میں آکر مولانا مدنی پر سخت تنقید کی جس کا اظہار اس قطعے میں کیا ہے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد، ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن ست — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

جب حضرت مولانا مدنی رح کی نظر سے یہ قطعہ گزرا تو آپ نے اخبارات میں بیان

شائع کروا دیا کہ میں نے ملت کا لفظ نہیں استعمال کیا ہے بلکہ قوم کا لفظ استعمال کیا ہے کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے ۔مولانا مدنی کا بیان جب اخبارات میں شائع ہوا تو جناب اقبال احمد صاحب سہیل نے جناب ڈاکٹر اقبال کے جواب میں ایک سخت نظم تحریر فرمائی اور ڈاکٹر صاحب پر تنقید کی ، نظم سولہ اشعار پر مشتمل تھی ، اُن میں سے دس شعر جو میری نوکِ زبان ہیں ملاحظہ ہوں ؎

کسے کہ خردہ گرفتست بر حسین احمد ۔ زبانِ او عجمی و کلامِ در عربی ست
کہ گفت بر سرِ منبر کہ ملت از وطن ست ۔ دروغ گوئی و ایراد ، ایں چہ بوالعجبی ست
درست گفتِ محدث کہ قوم از وطن ست ۔ کہ مستفاد ز فرمودۂ خدا و نبیؐ ست
زبانِ طعن کشودی و ایں ندانستی ۔ کہ فرقِ ملت و قوم از لطائفِ ادبی ست
تفاوتے ست فراواں میانِ ملت و قوم ۔ یکے ز کیش دگر کشوری ست یا نسبی ست
خدائے گفت بہ قرآں لکلّ قوم ھاد ۔ مگر نہ نکتہ بجا پئے برد کسے کہ غبی ست
بقومِ خویش خطابِ پیمبراں بنگر ۔ پُر از حکایتِ "یا قوم" مصحفِ عربی ست
رموزِ حکمت و ایماں ز فلسفی جستن ۔ تلاشِ لذتِ عرفاں ز بادۂ عنبی ست
بہ دیوبند در آ گر نجات می طلبی ۔ کہ دیو نفس سلحشور و دانش تو صبی ست

بگیر راہِ حسین احمد ار خدا خواہی
کہ نائب است نبیؐ را و ہم ز آلِ نبیؐ ست

حضرت مولانا مدنی کا اخبارات میں بیان اور اقبال احمد صاحب سہیل کی تند کربالا نظم جب ڈاکٹر اقبال صاحب کی نظر سے گزری تو فوراً اخبار "مدینہ" بجنور مورخہ ۵ مارچ ۱۹۳۸ء میں مضمون شائع کرا دیا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے ، مجھے غلط خبر پہنچی تھی جس کی وجہ سے میں نے برافروختہ ہو کر اُن پر سخت تنقید کی ، اب اصل حقیقت مجھ پر منکشف ہو

گئی ہے اس لیے میں مولانا مدنیؒ سے خواستگارِ معافی ہوں، امید ہے کہ مولانا صاحبؒ مجھے معاف فرمائیں گے۔

ڈاکٹر اقبال صاحب نے تو معافی مانگ لی لیکن لوگوں نے اُن کے کلّیات سے قطعہ خارج نہیں کیا، اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا معافی نامہ ۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہُوا تھا اور اُن کا انتقال ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہُوا۔ اگر زیادہ دن تک زندہ رہتے تو یقین ہے کہ وہ خود قطعہ کو کلّیات سے خارج کر دیتے۔

(مطبوعہ "بُرہان" دہلی۔ اگست ۱۹۶۴ء)

نوٹ: اقبال احمد سہیل صاحب کی متذکرہ بالا نظم کے کل بیس اشعار تھے جو مجلّہ علیگڑھ انسٹیٹیوٹ میں شائع ہوئے تھے۔ باقی اشعار میں سے چند یہ ہیں:

بملّت ارچہ براہیمی است سرورِ ما — ولے بقومِ حجازی بہ نسلِ مُطّلبی ست

زقومِ خویش شمُردِ اہلِ کُفر را بہ اُحُد — رسُولِ پاک کہ نامش محمدِ عربیؐ ست

بلند تر بُود از قوم رُتبۂ ملّت — کہ حبلِ دین، قوی تر ز رشتۂ نسبی ست

مگر بہ ہموطنان درجہادِ استخلاص — مُجاہدانہ تعاون زرُوئے حق طلبی ست

سلوکِ رفق و مُدارا بہ جارِ ذی القربیٰ — عمل بحکمِ الٰہی و اتباعِ نبیؐ ست

محبتِ وطن است از شعارِ ایمان — ہمیں حدیثِ پیمبر فدیتُہ بابی ست

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

"اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدروقیمت کا اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے بالکل نئے اسلوب کا حامل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے اور میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلاخوف تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے۔ مغربی تہذیب کے مشاہیر سے استحساناً اور استمداداً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی اور ادبی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احمدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہے۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر الہ آبادی سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں

کی موجودہ ملتی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اُٹھتے ہیں ۔

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایۃً ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تعلیم کے بارے میں سر سیّد احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر بڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بُنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے، مجھے امید ہے کہ ان کی کڑوی کسیلی باتوں کو سُننے والے مجھے معاف فرماویں گے۔ آجکل کی طالبعلمانہ زندگی سے، چونکہ گزشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں جس کو مذہب سے قریب کا تعلق ہے لہٰذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سُنی جائیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہُوا ہے کہ مسلمان طالب علم اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے۔ رُوحانی طور پر بمنزلہ ایک بےجان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال قائم رہی تو وہ اسلامی رُوح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی اور وہ لوگ جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا، کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے۔ وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے :

(اقتباس "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" اقبال۔ ترجمہ ظفر علی خاں)

قاضی افضل حق قریشی

خراجِ تحسین

امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ

" صوفیا میں حضرت مجدد الف ثانیؒ، علما میں شاہ ولی اللہؒ، شعرا میں مرزا عبدالقادر بیدل، اور سلاطین میں سلطان ٹیپو شہیدؒ کا بالاستیعاب مطالعہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی اور تہذیبی کارناموں کی تاریخ کے اہم ستون ہیں۔" (بروایت راجہ حسن اختر۔ چٹان ۲۲ اپریل ۱۹۵۷ء ص ۱۳)

" میری رائے میں بہ حیثیت مجموعی زمانۂ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔" (خطوطِ اقبال۔ بنام سید محمد سعید الدین جعفری ص ۱۶۳)

" شاہ صاحب کی شخصیت بڑی عظیم ہے۔"۔۔۔ (ص ۳۰۱)

" شاہ صاحب کی نگاہیں بڑی دُور رس تھیں۔ ایک ایسے زمانے میں جب حکومت اور

عملداری کی طرح تو نے علم و عمل بھی ماؤف ہو رہے تھے اور لوگوں کو دلچسپی تھی تو بیشتر چند فرسودہ اور لاطائل بحثوں سے۔ شاہ صاحب کا سیاست اور معاش پر قلم اٹھانا ایک حیرت انگیز امر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ہماری نشاۃ الثانیہ کے نقیب ہیں۔ پھر فرمایا: حجۃ اللہ البالغہ منجملہ ان تصنیفات کے ہے جنھوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ کی رہنمائی کی۔ (اقبال کے حضور۔ صہ ۳۰۳)

"شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے مغربی ہند کے ملاحدہ کی رد اور اصلاح کے لیے مامور کیا تھا اور یہ کام انھوں نے نہایت خوبی سے کیا۔" (مکاتیب اقبال بنام محمد نیاز الدین خاں صہ ۵)

"ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں۔ غالباً یہ شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنھوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی۔" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صہ ۱۳۵)

"فلاسفۂ اسلام اور علمائے الٰہیات کے درمیان جو مسئلہ مختلف فیہ ہے وہ یہ کہ انسان کی بعثت ثانیہ پر کیا اس کا جسم بھی پھر سے زندہ ہو جائے گا؟ اس میں زیادہ تر خیال یہ ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی رائے بھی۔ جن کی ذات پر گویا الٰہیات اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ یہی تھی کہ حیات بعد الموت پر ایسا کوئی مادی پیکر ناگزیر ہے جو خودی کے نئے ماحول میں اس کے مناسب حال ہو۔" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صہ ۱۸۶)

"رہبانیت دنیا کی ہر مستعد قوم میں اس کے عملی زوال کے وقت پیدا ہوئی ہے، اس کا مٹانا ناممکن ہے کہ بعض رہبانیت پسند طبائع ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ

صرف اس قدر ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کریں اور اس کو رہبانیت کے زہریلے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ ہم وحدت الوجودیوں کو مسلمان بنانا نہیں چاہتے بلکہ مسلمانوں کو ان کے تخیلات کے دام سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، اگر ہم حق پر ہیں تو خدا ہماری حمایت کرے گا اور اگر ہم ناحق پر ہیں تو ہم فنا ہو جائیں گے۔ ابن تیمیہ، ابن جوزی، زمخشری اور ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت عالمگیر غازی، شاہ ولی اللہ محدث، دہلوی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی نے یہی کام کیا ہے اور ہمارا مقصد صرف اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا ہے اور کچھ نہیں۔"

(مقالات اقبال ص۱۷۱)

سیّد احمد شہیدؒ

"جاوید نامہ میں بہت سی باتوں کا ذکر رہ گیا۔ میرا تو جی چاہتا تھا سیّد احمد بریلوی اور سیّد احمد دہلوی کی روحوں کو بھی اس میں جمع کر دوں لیکن خیال نہ رہا۔ علاوہ اس کے اور بھی کئی باتیں میرے ذہن میں ہیں بلکہ میں نے بہ طور یادداشت کہیں لکھ بھی رکھا ہے۔ موقعہ ملا تو ان کا ذکر بھی کر دیا جائے گا۔" (اقبال کے حضور ص ۶۴)

"وہابی تحریک ایک چنگاری تھی، جس سے عالم اسلام میں ہر کہیں تقلید اور استبداد کے خلاف ایک آگ بھڑک اٹھی۔ صدیوں کا جمود ٹوٹا۔ قوائے علم و عمل شل ہو رہے تھے۔ ان میں پھر سے حرکت پیدا ہوئی۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ مغرب کے سیاسی اور معاشی تغلب کے خلاف ایک محاذ قائم ہونا چاہیے"

"عالم اسلام میں شعلۂ حیات کبھی افسردہ نہیں ہوا لیکن اٹھارھویں صدی میں اس نے کئی ایک ممالک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔"

"یوں جن تحریکوں کا ظہور ہُوا، ان میں ایک علاقہ سا قائم ہو گیا۔ حالانکہ اکثر و بیشتر ان میں باہم کوئی تعلق نہیں تھا بجز سطحی مشابہت کے۔ مثلاً یہی کہ جہاں کہیں بدعات کے خلاف کوئی آواز اُٹھی اُسے بھی وہابیت سے تعبیر کیا گیا۔ حتّٰی کہ حضرت سید احمد کی تحریک جہاد بھی وہابی تحریک ہی سے موسوم ہوئی"

ہم نے عرض کیا آپ کے ارشادات کا مطلب گویا یہ ہے کہ وہابی تحریک تو آزادیٔ اجتہاد کی تحریک تھی اور مقصد ردّ تقلید، غیر اسلامی تصورات اور بدعات کی آلائشوں سے امت کی تطہیر اس کا مدعا تھا اصلاح، جیسا کہ آپ نے خود بھی فرمایا ہے۔

فرمایا "یہ درست ہے"

پھر ارشاد ہُوا اور اب اشارہ تحریکِ جہاد کی طرف تھا۔

"کوئی بھی تحریک ہو اُسے ناکامی اور کامرانی ہر طرح کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تحریکِ جہاد کا ایک مرحلہ وہ تھا جو بالاکوٹ میں ختم ہُوا، دوسرا وہ جب یہ تحریک سرحد میں محدود ہو کر رہ گئی اور گو ۱۸۶۲ء کے بعد انگریزی حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیاں سُست پڑ گئیں، بایں ہمہ حکومت کو ان کی طرف سے کبھی اطمینان نہ ہُوا۔ اس تحریک کے بچے کھچے عناصر ہندوستان میں بھی موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی انگریزوں کے خلاف کوئی تحریک اُٹھی تو انھیں بھی موقع ملا کہ اپنی دعوتِ جہاد کو از سرِ نو تازہ کریں، خواہ کسی رنگ میں"۔ (اقبال کے حضور، ص ۳۲۱-۳۲۲)

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

سیالکوٹ میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی لندن، جرمنی سے اور میری حرمین شریفین اور دیگر

بلاد اسلامیہ سے واپسی پر ان کے مکان پر میری ان سے ملک ہندوستان کے سیاسی حالات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس کے دوران میں آپ نے فرمایا کہ "اگر مولانا محمد سمٰعیل شہیدؒ کے بعد ان کے مرتبے کا ایک مولوی بھی پیدا ہو جاتا تو آج ہندوستان کے مسلمان ایسی ذلت کی زندگی نہ گزارتے"

(تاریخ اہل حدیث ص ۴۲۲)

ڈاکٹر مرحوم کہا کرتے تھے کہ "ہندوستان نے ایک مولوی پیدا کیا اور وہ مولوی محمد سمٰعیل کی ذات تھی" (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ صفحہ ۵۰)

"مجدد الف ثانیؒ، عالمگیرؒ اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیا کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا" (اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۴۹ بنام اکبر الٰہ آبادی)

"تاریخ تصوف سے فارغ ہو لوں تو تقویۃ الایمان کی طرف توجہ کروں۔ فی الحال جو وقت ملتی ہے وہ اسی مضمون کی نذر ہوتی ہے" (اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۵۲ ایضاً)

"مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی عبقات، قاضی محب اللہ کے جوہر لفرد اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی" (اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۱۳۲ بنام سید سلیمان ندوی)

مولانا سید جمال الدین افغانی

سید السادات مولانا جمال   زندہ از گفتار او سنگ و سفال

" زمانۂ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر و ایران، ترکی، ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخرالذکر ہی اصل میں موسس ہے زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا۔" (بنام چوہدری محمد احسن)

———— (اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۳۱، ۲۳۲)

" مولانا سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔ جمال الدین افغانی دُنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ اُن کی بے چین رُوح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہٗ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائد بن گئے جیسے مصر کے زاغلول پاشا وغیرہ انھیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے لکھا کم اور کہا بہت اور اس طریقہ سے ان تمام لوگوں کو جنھیں ان کا قرب حاصل ہُوا چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انھوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانہ کے کسی شخص نے رُوحِ اسلام میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی جس قدر کہ انھوں نے کی تھی۔ ان کی رُوح اب بھی دُنیائے اسلام میں سرگرم عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوگی۔" (حرفِ اقبال ص ۱۴۹)

————

" ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر

کے دوبارہ غور کریں۔ بظاہر شاہ ولی اللہ دہلوی نے سب سے پہلے بیداریٔ رُوح کا احساس دلایا۔ مگر اس کام کی اہمیت کا اندازہ سید جمال الدین افغانی کو تھا جو اسلام کی ملی حیات اور ذہنی تاریخ میں عمیق نظر رکھنے کے علاوہ انسانی عادات و خصائل کا بے نظیر تجربہ رکھتے تھے اُن کی نظر میں بڑی وسعت تھی۔" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صـ ۱۵۲)

مولانا عبداللہ غزنوی

مولوی عبداللہ غزنوی آج حدیث کا درس دے رہے تھے کہ اُن کو اپنے بیٹے کے قتل کی خبر موصول ہوئی۔ ایک منٹ تامل کیا پھر طلباء کو مخاطب کر کے کہا :

"ما برضائے او راضی ہستیم۔ بیائید کہ کار خود بکنیم"

یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف ہو گئے۔

مخلص مسلمان اپنے مصائب کو بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔

(انوار اقبال صـ ۲۷ مکتوب بنام محمد دین فوق)

دار العلوم دیوبند

" دیوبند ایک ضرورت تھی۔ اِس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل۔ وہ روایت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم ہے۔" (اقبال کے حضور صـ ۱۹۳)

" میری رائے ہے کہ دیوبند اور ندوہ کے لوگوں کی عربی علمیت ہماری دوسری یونیورسٹیوں کے گریجوئیٹ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔" (اقبال نامہ حصہ دوم صـ ۲۲۳)

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی

"بصیریؒ کو چادر عطا ہونا کئی روایات میں آیا ہے۔ گزشتہ خط میں اس کا حوالہ لکھنا بھول گیا تھا۔ مولوی ذوالفقار علی دیوبندی نے شرح قصیدہ بُردہ میں منجملہ اور روایات کے یہ روایت بھی لکھی ہے۔" (اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۹۸ بنام سید سلیمان ندوی)

(شیخ الہند) حضرت مولانا محمود حسن صاحب

"معارف" میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قبلہ کا ایک خط شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے طرفہ کا ایک مقبول عربی شعر نقل کیا ہے۔ کیا آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا کر سکتے ہیں کہ یہ خط مالٹا سے کون سی تاریخ کو لکھا گیا تھا؟" (اقبال نامہ حصۂ اول صفحہ ۱۵۸ بنام سید سلیمان ندویؒ)

ترکِ موالات کے مسئلے پر انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے اجلاس مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۲۰ء میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا:

"اس عرصے میں میرے پاس متعدد فتوے موصول ہو چکے ہیں جن میں علمائے ہند کا ایک فتویٰ ہے جس پر اُنتالیس علمائے کرام کے دستخط ہیں۔ علمائے فرنگی محل، علمائے دہلی، علمائے مدرسہ الٰہیات کانپور کے فتوے بھی موصول ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کا فتویٰ بھی پہنچا ہے۔" (اقبال اور انجمن حمایت اسلام صفحہ ۹۷)

عریضۂ اقبال بخدمت مولانا محمّد انور شاہ کشمیریؒ

لاہور ۱۳ مارچ ۱۹۳۵ء

مخدوم و مکرّم حضرت قبلہ مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مجھے ماسٹر عبداللہ صاحب سے ابھی معلوم ہُوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرماویں گے۔ مَیں اسے اپنی بڑی سعادت تصوّر کروں گا۔ اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب، قبلہ عثمانی حضرت مولوی شبّیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں یہی التماس ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لیے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔"

مخلص

محمّد اقبال

(اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۵۷)

"مشہور حدیث لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ میں 'دہر' (بمعنی TIME) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولوی سیّد انور شاہ صاحب سے، جو دُنیائے اسلام کے جیّد ترین محدّثینِ وقت میں سے ہیں، میری خط و کتابت ہوئی۔" (انوارِ اقبال ص ۲۵۵)

"اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے"

(بیس بڑے مسلمان ص ۳۷۵)

مولانا اشرف علی تھانوی

" مولوی اشرف علی جہاں تک مجھے معلوم ہے وحدت الوجود کے مسئلے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے ان کی کتاب عمدہ ہوگی"

——— (مکاتیب بنام محمد نیاز الدین خاں ص۵۰)

" حضرت! میں نے مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کو بیداری میں پڑھا ہے اور بار بار پڑھا ہے۔ آپ نے شاید اسے سکر کی حالت میں پڑھا ہے کہ اس میں آپ کو وحدت الوجود نظر آتا ہے۔ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی سے پوچھئے وہ اس کی تفسیر کس طرح کرتے ہیں میں اس بارے میں ان کا مقلد ہوں۔" (مقالات اقبال ص۱۸۰) بنام خواجہ حسن نظامی

———

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

" میں اُن کے احترام میں کسی اور مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں" (انوار اقبال ص۱۶۷)

———

" میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا"۔۔

" مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں"۔

——— (مکتوب بنام مدیر احسان ، انوار اقبال ص۱۶۷)

عریضۂ اقبال بخدمت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی ؒ

لاہور ۸ / اگست ۱۹۳۳ء

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ السلام علیکم

اگرچہ زیارت اور استفادہ کا شوق ایک مدت سے ہے تاہم اس سے پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا۔ اب اس محرومی کی تلافی اس عریضہ سے کرتا ہوں۔ گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہوگی۔ بہر حال جناب کی وسعتِ اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیشِ نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے۔

مَیں نے گزشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تقریر کی تھی جو وہاں کے اداشناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اب پھر ادھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے۔ نظر بایں حال چند امور دریافت طلب ہیں، جناب کے اخلاقِ کریمانہ سے بعید نہ ہوگا۔ اگر ان سوالات کا جواب شافی مرحمت فرمایا جائے۔

(۱) اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقتِ زمان کے متعلق کیا کہا ہے اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے۔

(۲) یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں؟ اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اوّل کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں۔

(۳) حضرات صوفیا میں سے اگر کسی اور بزرگ نے بھی حقیقتِ زمان پر بحث کی ہو تو اُن بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں۔ مولوی سید انور شاہ مرحوم و مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا۔ اس کا نام تھا "درایۃ الزمان"۔ جناب کو ضرور اس کا

علم ہوگا۔ میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے۔ اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے۔

میں نے سُنا ہے کہ جناب کے درس و تدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا ہے۔ اس واسطے مجھے یہ عریضہ لکھنے میں تامل تھا لیکن چونکہ مقصود خدمتِ اسلام ہے مجھے یقین ہے کہ اس تصدیعہ کے لیے جناب مجھے معاف فرمائیں گے اور جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے۔

باقی التماسِ دُعا۔ مخلص

محمد اقبال۔ بیرسٹر ایٹ لا، لاہور (اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۲۱-۴۲۲)

شاہ سُلیمان پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ

"آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمالِ رُوحانی کے ساتھ علم و فضل سے آراستہ کیا ہے۔"

(مکتوب، انوارِ اقبال ص ۱۸۱)

ندوۃ العلماء لکھنو

میرا ایک مدت سے یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالکِ اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں "ندوۃ" علی گڑھ سے زیادہ کار آمد ثابت ہو۔" (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۴۹ بنام سید سلیمان ندوی)

مولانا شبلی نعمانی ، مولانا سید سلیمان ندوی

"میں چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علما و فصحا سے اس سے پیشتر فائدہ پہنچا ، اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے ۔ مولانا شبلی مرحوم کی زندگی میں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو جائیں ، مگر میری کوشش بار آور نہ ہوئی ۔" (مکتوب بنام سلیمان ندوی)

(اقبال نامہ حصہ اول ص۶۷)

"مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ اُستاذ الکل ہیں" (ایضاً ص۸۰)

"رات کو سیرت نبویؐ کا مطالعہ رہتا تھا ۔ مولانا مرحوم نے " انو " پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربارِ نبویؐ سے عطا ہوگا ۔" (اقبال نامہ حصہ اول ص۸۵)

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے ... اگر مولانا شبلیؒ زندہ ہوتے تو میں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا ۔"

(اقبال نامہ حصہ اول ص۱۴۳)

"آپ اُمت محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس مامور من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امر الٰہی ودیعت کیا گیا ہے ۔ فرقہ یاسیہ کو چھوڑ کر فرقہ رجائیہ میں آجائیے ۔ جس حقیقت کو آپ زیر پردہ دیکھ چکے ہیں ، اس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے ۔"

(اقبال نامہ حصہ اول ص۹۸)

" اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے، تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کرسکتا۔ فی الحال انشاء اللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔"

——— (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۵۱، ۱۵۲، بنام سید سلیمان ندوی)

" علوم اسلام کی جُوئے شیر کا فرہاد، آج ہندوستان میں سوائے سید سُلیمان ندوی کے اور کون ہے "؟ (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۶۶)

" آپ کا وجود ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ازبس ضروری ہے اور مجھے یقین ہے کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی دُعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا ہے تاکہ وہ دیر تک آپ کے علوم سے مُستفیض ہوتے رہیں "۔ (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۹۷)

" مولانا سید سُلیمان ندوی کی علالت کی خبریں بہت متردد کر رہی ہیں، خدا تعالیٰ ان کو صحتِ عاجل مرحمت فرمائے۔ میری طرف سے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفسارِ حالات کیجیے۔ اس وقت علماء ہند میں وہ نہایت قابلِ احترام ہستی ہیں۔ خدا اُن کو دیر تک زندہ رکھے "۔ (اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۰۱) بنام مسعود عالم ندوی

" اخباروں میں مولانا سید سُلیمان ندوی کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہُوئی۔ خدا تعالیٰ ان کو دیر تک سلامت رکھے۔ ان کا وجود اس ملک میں غنیمت ہے "۔

——— (اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۰۲)

مولانا ابُوالکلام آزاد

"الحمد للہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی۔ مولانا آزاد اب کہاں ہیں، پتہ لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں" (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۰۰، ۱۰۱)

"میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی"۔

——— (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۱۱)

مولانا محمد علی جوہر

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں درگزشت

اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم
از کنار اندلس از ساحلِ بربر گزشت

خاکِ قدس او را بآغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

می نگنجد جز بآں خاکی کہ پاک از زنگ بوست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت

جلوۂ او تا ابد باقی بچشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہی خاور از خاور گزشت

———

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

"شاہ جی سلام کی چلتی پھرتی تلوار ہیں" (چٹان سالنامہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۱)

"مجھے مجلس خلافت کے ان ارکان سے ہمدردی ہے جو اپنی مجلس کی تجویز کے مطابق نیک نیتی سے یہ سمجھتے ہوئے قید ہوئے کہ وہ ایک پاک مقصد کی خاطر ایثار کر رہے ہیں۔ خاص کر مولوی سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی ایسے مشہور کارکنوں کے ساتھ ہمدردی ہے ہمیں ان کی بعض رایوں سے خواہ اختلاف بھی ہو لیکن عقل اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے۔ کہ ان کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے۔ وہ قومی کاموں میں بہت حصہ لیتے ہیں اور ضرورت کے وقت بڑا ایثار دکھاتے ہیں۔" (گفتار اقبال ص ۴۰-۱۴۱)

علامہ اقبال مرحوم نے یہ نظم ۱۹۲۱ء میں لکھی تھی، جب تحریک خلافت شباب پر تھی اور شاہ صاحبؒ تین سال کے لیے زندانِ فرنگ میں اسیر و محبوس کر دیے گئے تھے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند

قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے

مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر

کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست

ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

"شاہ جی" مرتبہ نذیر مجیدی صفحہ ۳۹۶ جدید بک ڈپو لاہور ۱۹۶۵ء۔ (بحوالہ سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاری از خان کابلی مطبوعہ لاہور ۱۹۴۰ء)

"میں نے کہا آپ کے نزدیک موجودہ ہندی اسلامی تحریکوں میں کون سی تحریک مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا "عموماً ان تحریکوں کے قائد جاہل ہیں"۔ احرار کے متعلق کہا" ان سے کسی قدر اصلاح کی امید ہوسکتی ہے"۔ (ملفوظاتِ اقبال ۶۹)

مردانِ خُدا

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیّاری!
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری!
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انھیں کا طوافِ بُتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زنّاری!

مولانا غلام مرشد، مولانا احمد علی، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ

بخدمت مولانا غلام مرشد، مولانا احمد علی، مولانا ظفر علی خاں، سید حبیب، مولوی نور الحق، سید عبد القادر اور مولانا مہر صاحبان

جناب مکرم

السلام علیکم۔ ایک نہایت ضروری امر میں مشورہ کرنا ہے۔ آج آٹھ بجے شام غریب خانہ پر تشریف لا کر مجھے ممنون فرمائیے۔ مشورہ طلب امر نہایت ضروری ہے۔ امید کہ آپ تکلیف معاف فرمائیں گے۔

مخلص محمد اقبال بیرسٹر لاہور ۵ ستمبر ۲۹ء

"ضروری امر جیسا کہ مہر صاحب بیان کرتے ہیں مسلمانوں کے فقہی مسائل کے متعلق مشورہ تھا۔" (انوار اقبال ص ۹۲-۹۳)

کتابیات

بدرالدین احمد: سوانح احمد رضا خاں۔ براؤں۔ یوپی: مکتبہ لطیفیہ۔ ۱۹۶۴ء

بشیر احمد ڈار: انوارِ اقبال: کراچی۔ اقبال اکادمی۔ ۱۹۶۷ء

داناپوری، محمد طیب: تجانب اہل السنہ عن اہل الفتنہ: پیلا بھیت، دفتر جماعت مبارکہ اہلسنت۔ ۳۶۱ھ

رفیق افضل: گفتارِ اقبال: لاہور۔ ادارہ تحقیقات پاکستان۔ ۱۹۶۹ء

سالک، عبدالمجید: ذکرِ اقبال: لاہور۔ بزمِ اقبال۔ ۱۹۵۵ء

سیالکوٹی، مولانا محمد ابراہیم: تاریخ اہل حدیث: لاہور۔ ۱۹۵۳ء

شاہد، محمد حنیف: اقبال اور انجمن حمایت اسلام: لاہور: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام ۱۹۷۶ء

شروانی، لطیف احمد: حرفِ اقبال: لاہور۔ ایم ثناء اللہ

شورش کاشمیری: فیضانِ اقبال: لاہور۔ مطبوعاتِ چٹان۔ ۱۹۶۸ء

عبداللہ بٹ: شاہ اسمٰعیل شہیدؒ: لاہور۔ قومی کتب خانہ۔ ۱۹۴۳ء

عطاء اللہ شیخ: اقبال نامہ حصہ اول و دوم: لاہور۔ اشرف۔ ۱۹۵۱ء

مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان: لاہور۔ بزمِ اقبال (س۔ن)

معینی، سید عبدالواحد: مقالاتِ اقبال: لاہور۔ اشرف۔ ۱۹۶۳ء

نور محمد، مولانا: تکفیری افسانے: لاہور۔ مولانا محمد دین۔ ۱۹۷۶ء

نیازی، سید نذیر: اقبال کے حضور: کراچی۔ اقبال اکادمی۔ ۱۹۷۱ء

ہاشمی، رفیع الدین: خطوطِ اقبال: لاہور۔ مکتبہ خیابانِ ادب۔ ۱۹۷۶ء

رسائل

چٹان: لاہور ۱۰: ۱۶ (۲۲ اپریل ۱۹۵۷ء)

صحیفہ: لاہور ۶۵ (اکتوبر ۱۹۷۳ء)

